نئی دنیا کی جھلکیاں

(۲)

موجودہ سماج میں طبقاتی نظام

مصنف

ٹی۔ بی۔ بوٹومور

مترجم

گوپال متل

ناشرین:- نیشنل اکاڈمی۔ ۱۰،۹ انصاری مارکیٹ۔ دریا گنج دہلی

اشاعت اوّل مئی ۱۹۵۹ء

قیمت پچیس نئے پیسے یا چار آنے

مطبوعہ

یونین پرنٹنگ پریس۔ دہلی

فہرس

عرض ناشر	۴
تمہید	۵
سماجی طبقے کی نوعیت	۱۰
کمیونسٹ اور جمہوری سماجوں میں طبقات کا وجود	۲۵
سماجی طبقے کا مفہوم	۴۹

عرضِ ناشر

موجودہ دنیا اتنی تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے کہ ایک عام آدمی کے لئے ان تبدیلیوں کو پوری طرح سمجھنا دشوار سے دشوار تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس دور کو انقلابی دور تو سبھی کہتے ہیں لیکن اس انقلاب کے حقیقی مفہوم اور اس کی سمت کو معلوم کرنے کی سنجیدگی سے بہت کم کوشش ہوئی ہے۔ فضا میں گونجنے والے نعرے گمراہی کا باعث تو بنتے ہیں لیکن آدمی کی حقیقی معلومات میں کوئی اضافہ نہیں کرتے۔

موجودہ مسائل پر سنجیدہ اور معلومات افزا کتابیں اوّل تو اردو میں نایاب ہیں اور جو شائع ہوتی ہیں ان کی قیمت اتنی گراں ہے کہ انہیں خریدنا ایک عام آدمی کی دسترس سے باہر ہے۔ نیشنل اکاڈمی کو فخر ہے کہ وہ اس بہت بڑی کمی کو پورا کرنے کی طرف اہم قدم اٹھا رہی ہے۔
"نئی دنیا کی جھلکیاں" ایک ایسا سلسلہ ہے جس میں وقتاً فوقتاً وقت کے اہم ترین مسائل پر خالص علمی اور غیر جذباتی انداز میں کتابیں شائع ہوتی رہیں گی اور انہیں عوام تک پہنچانے کیلئے یہ فیصلہ بھی کیا گیا ہے کہ ان کی قیمت بہت واجبی رکھی جائے یعنی فی کتابچہ صرف ۲۵ نئے پیسے۔

سردست اس سلسلے میں مندرجہ ذیل چار کتابیں شائع کی جا رہی ہیں۔

(۱) ہمارے دور کا انقلاب (۲) تہذیبی سامراج

(۳) اقتصادی تعاون (۴) موجودہ سماج میں طبقاتی نظام

ہم اپنے قارئین کو یقین دلاتے ہیں کہ یہ سلسلہ یہیں پر ختم نہیں ہوگا اس میں اور بھی بہت سی مفید کتابیں شائع کی جائیں گی۔

گوپال متل
مہتمم نیشنل اکاڈمی

سماج کی طبقوں اور طبقوں کی مختلف تہوں میں تقسیم جو وقار و اقتدار کے لحاظ سے ایک سلسلۂ مدارج قائم کرتی ہے سماجی تنظیم کا ایک اہم اور قریب قریب عالم گیر پہلو ہے جسے فلسفیوں اور سماجی نظریات پر غور و فکر کرنے والوں نے ہمیشہ اپنی توجہ کا مستحق سمجھا ہے۔ تاریخ انسانی کے بیشتر ادوار میں اس انسانی عدم مساوات کو ایک ایسی حقیقت کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا ہے جو ناقابل تغیر ہے۔ لہٰذا جہاں تک قدیم اور دور وسطیٰ کے مصنفوں کا تعلق ہے انھوں نے اس سلسلۂ مدارج کو ہمیشہ برحق ٹھہرایا ہے اور اس کا جواز پیش کیا ہے۔ بسا اوقات اس جواز نے مذہبی تصورات کی شکل اختیار کر لی ہے۔

سماجی طبقوں میں عدم مساوات کا جو اصول مضمر ہے اس پر سائنٹفک تحقیقات اور مسلسل تنقید کا عمل موجودہ دور بالخصوص امریکی اور فرانسیسی انقلابوں کے بعد ہی شروع ہوا ہے۔ مساوات کا انقلابی تصور خواہ اسے انیسویں صدی کے مفکروں نے کتنے ہی مختلف پیرایوں میں شروع کیا ہو کم از کم ورثتی مراعات اور کسی ایسی درجہ وار تقسیم کی ضد ضرور تھا جو ناقابل تنسیخ ہو۔ اٹھارویں صدی کے انقلاب جو آئینی اور سیاسی مراعات اور نظامِ جاگیرداری کے خلاف تھے۔ ان کے نتیجہ کے طور پر شہری اور سیاسی حقوق میں توسیع ہوئی اور بہت بڑی حد تک ترقی کے مواقع بھی سب کے لئے یکساں ہو گئے لیکن اس کے ساتھ ہی ان انقلابوں نے سماج میں ایک نیا سلسلۂ مدارج بھی قائم کر دیا۔ دولت کے اعتبار سے اس نئی درجہ وار ترتیب پر وہ لوگ معترض ہوئے جن کا یقین تھا کہ نظریۂ مساوات اپنے آخری مفہوم میں "غیر طبقاتی سماج" کا تصور لئے ہوئے تھا۔

گزشتہ سو سال کے دوران اقتصادی طور پر ترقی یافتہ ملکوں کے سماجی نظام میں انقلابی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اس دور کی تاریخ زیادہ تر سماجی زندگی کے نئے شعبوں میں اصولِ مساوات کی کارفرمائی کی داستان ہے۔ اصولِ مساوات کے اس فروغ کو بعض مصنفوں نے شہریت کی نشو ونما کا نام بھی دیا ہے[1]۔ وہ سرمایہ داری جس کی بنیاد تجارت میں حکومت کی عدم مداخلت کے اصول پر قائم تھی۔ انیسویں صدی میں بہت بڑی حد تک ناپید ہوگئی اور اس کی جگہ سماجی تنظیم کے متعدد نئے طریقوں نے لے لی۔ جن میں امریکہ کا نیا کاروباری ضابطہ بھی شامل ہے، فلاحی ریاست کا تصور بھی اور سوویٹ کمیونزم بھی۔ تمام ترقی یافتہ سرمایہ دار ملکوں میں غیر طبقاتیت کی طرف قدم بڑھائے گئے ہیں۔ دولت اور آمدنیوں کی نابرابری پر پابندیاں بھی لگائی گئی ہیں اور اسے محدود بھی کیا گیا ہے۔ کم سے کم معیارِ زندگی کے اصول کو تسلیم کر لیا گیا ہے اور مشترکہ تمدن کا ایک ایسا نظام قائم کر دیا گیا ہے جو سب کے لئے ہے۔ ان میں سے بیشتر سماجوں میں انفرادی ترقی کے مواقع میں وسعت پیدا ہوگئی ہے، طبقاتی حد بندیاں کمزور پڑ گئی ہیں اور ان کے نتیجے کے طور پر ایک طبقہ کے لوگ دوسرے طبقے میں بہ آسانی پہنچنے لگے ہیں اور اس عمل کی جتنی کارفرمائی اس وقت ہے اتنی پہلے کے کسی سماجی نظام میں نہیں تھی۔ لیکن سماجی طبقوں کی ساخت اور ان کی اہمیت میں خواہ کتنی بھی تبدیلی کیوں نہ ہوگئی ہو وہ موجود ضرور ہیں۔

دوسری طرف، کمیونسٹ ملکوں کا دعویٰ یہ ہے کہ ان کی منزلِ مقصود ایک غیر طبقاتی سماج کا قیام ہے اور یہ کہ جہاں تک سوویٹ روس کا تعلق ہے اس مقصد

---

[1] اس سلسلے میں ایل۔ ٹی۔ ہاب ہاؤس کی کتاب "ارتقا میں اخلاق کی کارفرمائی" اور ٹی۔ ایچ۔ مارشل کی کتاب "شہریت اور سماجی طبقے" خاص طور پر قابلِ مطالعہ ہیں۔ افسوس کہ تاحال ان کا اردو میں ترجمہ نہیں ہوا۔

کے حصول کی طرف کافی پیشقدمی ہوئی ہے۔ اس دعوے اور جمہوری ملکوں پر اس تنقید نے کہ وہ صرف آئینی مفہوم میں رسمی طور پر ہی جمہوری ہیں اور واقعتاً ان پر ایک حقوق یافتہ طبقے کی حکومت ہے جو وسائل پیداوار کے مالکوں پر مشتمل ہے بعض ایسے لوگوں کو بھی متاثر کیا ہے جو کمیونسٹ نظریئے کے دوسرے پہلوؤں سے نفرت کرتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ کمیونسٹوں میں اور خواہ کتنے ہی نقائص کیوں نہ ہوں لیکن وہ انسانی مساوات کے حامی ضرور ہیں اور مراعات کے بھی دشمن ہیں۔

گزشتہ چند برسوں کو چھوڑ کر نہ تو کمیونزم کے ان دعاوی کا گہرا مطالعہ کیا گیا ہے اور نہ کمیونزم کی عملی کامیابیوں کا۔ سوویٹ روس کے نقادوں نے اپنی توجہ زیادہ تر اس نظام حکومت کی بدیہی برائیوں پر ہی مرکوز رکھی ہے مثلاً سیاسی آزادی کا فقدان اور ریاست کا دہشت تر نظام جبر۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت تو بہت سے لوگ یہ بھی باور کئے ہوئے تھے کہ خود سیاسی ڈکٹیٹرشپ کی توضیح بھی یہ ہوسکتی ہے کہ وہ سماج کے ممبروں پر ایک "غیر قدرتی" حالت مساوات ٹھونسنے کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ بہر حال ایسا باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ انسانوں کو مساوات سے اتنی قوی اور قدرتی نفرت ہے کہ انھیں اسے قبول کرنے کے لئے بالجبر ہی آمادہ کیا جاسکتا ہے بلکہ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ مساوات کی آرزو دنیائے جدید میں غالباً قوی ترین سیاسی قوت ہے۔

اس کتاب کے مقاصد میں ایک مقصد یہ ہے کہ مساوات کے حق میں حالیہ تحریک کا اس حیثیت سے مطالعہ کیا جائے کہ سماجی طبقاتی نظام کے لئے وہ کیا مفہوم رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ سماجی طبقوں کی

نوعیت اور سماجی زندگی پر ان کے اثرات کا مختصر جائزہ لیا جائے۔ ایک مختصر سی کتاب میں سماجی طبقے کے تمام پیچیدہ مفاہیم کا تجزیہ ممکن نہیں اور میں نے زیادہ توجہ اس کے اقتصادی پہلوؤں پر ہی مرکوز رکھی ہے۔ اس طریق کار کا جواز یہ ہے کہ موجودہ سماجوں میں طبقات کی تشکیل اور ان کے استقرار میں اقتصادی عناصر کی اہمیت سبھی کو تسلیم ہے۔ اس ابتدائی جائزے کے بعد موجودہ دور کی متعدد سماجوں کے طبقاتی نظام کا ذکر کیا گیا ہے اور جمہوری اور کمیونسٹ سماجوں کی پالیسیوں اور ان کی کامیابیوں کا موازنہ بھی کیا گیا ہے۔ یہ تجزیہ صرف صنعتی سماجوں تک محدود ہے۔

آخری باب سماجی طبقے کے وسیع تر مفاہیم سے تعلق رکھتا ہے۔ کیا موجودہ سماجوں میں سماج کی درجہ وار ترتیب کا مطلب یہ ہے کہ ان سماجوں میں ایسے گروہوں کا وجود موجود ہے جنھوں نے ناجائز مراعات پر قبضہ کر رکھا ہے اور جن کی یہ حیثیت اور سرگرمیاں جمہوری آدرشوں سے متصادم ہیں اور ضروری سماجی اصلاحات کو عملی جامہ پہنانے کی راہوں میں مزاحم ہیں؟ کیا طبقاتی نظام سماج کی ایک ایسی تنظیم کے دوش بدوش ممکن ہے جو سب کے لئے مساوی حقوقِ شہریت کے اصول پر قائم ہو، جس میں یہ اصول تسلیم کر لیا گیا ہو کہ سماج کے تمام ممبروں کے شہری، سیاسی اور سماجی حقوق برابر ہیں؟

یہ بہت ضروری ہے کہ شروع ہی میں اس بحث کی حدود واضح کر دی جائیں سماجی طبقے کے مسئلے کو عام سماجی نابرابری کے مسئلے کے ساتھ خلط ملط نہیں کرنا چاہیئے سماجی طبقے کے علاوہ دوسری اقسام کی نابرابری بھی ہوتی ہے اور دوسری اقسام کی مراعات بھی۔ مثلاً وہ نابرابری اور وہ مراعات جو نسل، مذہب اور قومیت کے فرق پر مبنی ہیں۔ اسی طرح سماجی طبقے کے مسئلے کو سیاسی اقتدار کے مسئلے سے بھی خلط ملط نہیں کرنا چاہیئے۔ استبدادی حکومت اور جمہوری حکومت یا سیاسی

غلامی اور سیاسی آزادی کا وجود یا عدم وجود کافی حد تک سماج کے طبقاتی نظام سے آزاد اور الگ حیثیت رکھتا ہے، بالخصوص اقتصادی طبقاتی ڈھانچے اور جائداد کی تقسیم سے۔ جائداد کی ملکیت سیاسی اقتدار کی ایک بنیاد ضرور ہے لیکن وہ واحد بنیاد ہرگز نہیں۔ بیسویں صدی کے وسط میں ایسا باور کر لینے کی کوئی وجہ نہیں کہ جونہی وسائل پیداوار ریاست کی ملکیت بن جائیں گے، سیاسی آزادی کے لئے استبدادی سیاسی اقتدار کا خطرہ ختم ہو جائے گا۔

بہر حال یہ صداقت اپنی جگہ قائم ہے کہ سماجی طبقے جن سے مراد بنیادی طور پر اقتصادی گروپ ہیں دنیائے جدید میں نابرابری کے اہم ترین مظاہر ہیں اور یہ کہ ایک مخصوص طبقے کا اقتصادی غلبہ بیشتر صورتوں میں سیاسی غلبہ کی بنیاد بن جاتا ہے۔ لہٰذا طبقاتی نظام کے ادارے کا سماجی پالیسی کے تمام بڑے مسائل کے ساتھ تعلق ضرور ہے۔ یہ تعلق بدیہی بھی ہوتا ہے اور مضمر بھی۔

سماجی طبقے کی نوعیت

سماجی طبقے یا سماجی سلسلۂ مدارج کی حقیقی نوعیت کے متعلق عمرانیات کے ماہرین میں کسی قدر اختلاف رائے ہے۔ بہرحال اس کا بنیادی خاکہ کافی واضح ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ رتبوں کے مدارج کا سلسلہ ایک قدرتی یا ناقابل تغیر نظام کا حصہ نہیں بلکہ یہ ایک انسانی اختراع ہے۔ قدرتی نامساوات اور سماجی رتبہ دو مختلف چیزوں کے نام ہیں۔ روسو نے اس امتیاز کو مکمل طور پر واضح کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ نوعِ انسانی میں نامساوات کی دو قسمیں ہیں۔ ایک کو میں قدرتی یا جسمانی کا نام دونگا کیونکہ یہ قدرت کی قائم کردہ ہے۔ یہ نامساوات عمر، صحت جسمانی قوت اور ذہن اور روح کی اہلیتوں کے فرق پر مشتمل ہوتی ہے۔ دوسری نامساوات کو اخلاقی یا سیاسی نامساوات کا نام دیا جا سکتا ہے کیونکہ اس کا انحصار ایک رسم پر ہوتا ہے اور یہ رسم انسان کی رضامندی سے قائم کی جاتی ہے۔ کم از کم یہ رضامندی اس کا جواز ضرور ہوتی ہے۔ یہ نامساوات مختلف قسم کی مراعات پر مشتمل ہوتی ہے جن

لہ عمرانیات کے ماہر سماجی سلسلۂ مدارج کی اصطلاح سوسائیٹی کے مختلف گروہوں کی درجہ وار ترتیب کو بیان کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں وہ سماجی درجہ بندی کی مختلف قسموں کے درمیان امتیاز کرتے ہیں۔ اہم اہم قسمیں یہ ہیں۔ فرقہ، جاگیر، سماجی طبقہ اور سماجی درجہ۔ فرقے اور جاگیر کی اہم اہم خصوصیات، کافی معروف ہیں۔ سماجی طبقے اور سماجی درجے کے مفہوم کو متعین کرنا نسبتۃً مشکل ہے۔ لیکن اس کتاب کے متن میں ان پر مختصر بحث کی گئی ہے۔

سے کچھ لوگ دوسروں کو ضرر پہنچا کر مستفید ہوتے ہیں۔ مثلاً زیادہ امیر، زیادہ باعزت یا زیادہ مقتدر ہونا یا کوئی ایسی پوزیشن حاصل کر لینا جو دوسروں سے اطاعت کی متقاضی ہو[۵۱]۔"

عمرانیات کے بیشتر ماہرین جدید سماجی طبقوں کے سلسلے میں بھی اسی قسم کا امتیاز کرتے ہیں۔ مثلاً ٹی۔ ایچ۔ مارشل رقمطراز ہے "۔۔۔۔ طبقے کا ادارہ کسی سماج کے ممبروں کو یہ درس دیتا ہے کہ لوگوں کو سماجی استحقاق کے نظام میں جگہ دیتے وقت چند فرق پیش نظر رکھیں اور باقیوں کو نظر انداز کر دیں[۵۲]۔"

اس فرق کو تسلیم کرتے وقت یہ بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ موجودہ سرمایہ دار[۵۳]

۵۱۔ جے۔ جے۔ روسو کی تصنیف "انسانی نا مساوات کی ابتدا اور بنیاد پر ایک مقالہ"

۵۲۔ ٹی۔ ایچ۔ مارشل کی کتاب "شہریت اور سماجی طبقے کے اندر طبقاتی کشمکش کی نوعیت"

۵۳۔ میں "سرمایہ داری" اور "سرمایہ دار سماج" کی اصطلاحیں اسی مفہوم میں استعمال کرتا ہوں جس میں معاشی مورخ اور عمرانیات کے ماہر انھیں بالعموم استعمال کرتے ہیں۔ ان سے مراد ایک مخصوص تاریخی دور کا اقتصادی اور سماجی نظام ہے جس کی اہم خصوصیات ہیں کاروبار کی آزادی، آزاد مزدوروں کا وجود یہ الفاظ دگر ایسے لوگوں کا وجود جو آئینی طور پر اپنی قوت محنت کو بازار میں فروخت کرنے کے مجاز ہیں اور اقتصادی طور پر اس کے لئے مجبور۔ اس نظام سے یہ مراد بھی ہے کہ وسائل پیداوار صنعتی کارخانہ داروں کی نجی ملکیت ہیں۔ یہ اور اس قسم کی دوسری خصوصیات کی بنا پر سرمایہ داری اور دوسری قسم کے سماجی نظاموں مثلاً جاگیرداری کے درمیان کافی حد تک واضح طور پر امتیاز کرنا ممکن ہے لیکن سماجی سائنسوں کے دوسرے خیالی ہیولوں کی طرح یہ اصطلاحات بھی ہماری گمراہی کا باعث ہو سکتی ہیں۔ میں ان تبدیلیوں کا پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں جو انیسویں صدی سے اس وقت تک سرمایہ دار سماج کے اندر رونما ہوئی ہیں۔ یہ بات کہ موجودہ برطانیہ یا موجودہ امریکہ کو سرمایہ دار سماج بجا طور پر کہاں تک کہا جا سکتا ہے جزواً واقعیت سے تعلق رکھتی ہے اور جزواً اصطلاحات سے۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ انھیں سرمایہ دار سماج ہی کہنا چاہیئے۔ بہرحال انھیں کوئی بھی نام دیا جائے ہمیں ان پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے جو ان میں اور انیسویں صدی کی سرمایہ دار سماجوں میں خط امتیاز کھینچتے ہیں اور ان میں اور دوسری قسم کی سماجوں میں مماثلت پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً سوشلزم یا ایسا سماج جس کا کاروبار منصوبہ بندی کے سپرد ہو۔

سماجوں میں سماجی طبقاتی نظام کا عمل اس طرح ہوتا ہے کہ یہ قدرتی اہلیتوں اور سماجی طور پر تسلیم شدہ رتبے کے امتیازوں کی درجہ دار ترتیب کے قریب قریب مطابق ہی بن جاتا ہے۔ اس قسم کی دلیلیں بسا اوقات پیش کی گئی ہیں لیکن ان کی تائید میں واقعات نہیں پیش کیے گئے۔ یہ بات بالعموم مسلمات میں شامل ہے کہ آمدنیوں کی نامساوات طبقوں کی درجہ دار ترتیب قائم کرنے میں ایک اہم عنصر کا کام دیتی ہے لیکن اس سلسلے میں جو متعدد تحقیقاتیں کی گئی ہیں۔ انھوں نے ثابت کر دیا ہے کہ آمدنیوں کے غیر مساوی ہونے کا باعث زیادہ تر وراثت کے ذریعہ جائدادوں کی نامساوی تقسیم ہے نہ کہ کمائی ہوئی آمدنیوں کا فرق جن کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ ان کا قدرتی اہلیتوں کے ساتھ کوئی تعلق ہے۔ تعلیمی اور پیشہ ورانہ نقلِ اصلاح کے جو مطالعے کیے گئے ہیں ان سے اہلیتوں کی درجہ بندی اور سماجی پوزیشن میں ہم آہنگی کا فقدان ہی سامنے آتا ہے۔ مثال کے طور پر ذہنی قابلیت کا صلہ بالعموم اونچی آمدنی یا اعلیٰ سماجی رتبہ نہیں ہوتا۔ واقعتہً یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ سماجی طبقاتی نظام زیادہ تر جائداد کی وراثت کے ذریعہ ہی عمل پیرا ہوتا ہے جو اس امر کی ضمانت بن جاتا ہے کہ کسی خاص فرد کو سماج میں جو درجہ حاصل ہوتا ہے اس کا فیصلہ یہ بات کرتی ہے کہ وہ کس خاندان میں پیدا ہوا ہے۔ اس کی قدرتی صلاحیتوں سے اس سماجی پوزیشن کا تعلق نہیں ہوتا۔

سماجی طبقوں کی بنیادی خصوصیات اور وہ چیز جو انھیں فرقوں اور جاگیرداری پر مبنی گروپوں سے ممیز کرتی ہے یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر اقتصادی گروپ ہیں۔ ان کی پشت پر آئینی یا مذہبی جواز نہیں اور کسی خاص طبقے کی رکنیت کسی فرد کو کوئی خاص

---

(۱) اس سلسلے میں ایچ ڈالٹن کی کتاب "جدید سماجوں میں آمدنیوں کی نابرابری کے چند پہلو" ملاحظہ ہو۔

شہری یا سیاسی حقوق عطا نہیں کرتی۔ اس میں یہ مفہوم بھی مضمر ہے کہ طبقوں کی حد بڑی کافی حد تک غیر متعین ہیں۔ اگر بنیادی طبقے جنھیں ہم سرمایہ دار اور محنت کش مزدور طبقے کہہ سکتے ہیں بہ آسانی تمیز بھی کئے جا سکتے ہوں تو بھی متعدد درمیانی درجے جنھیں طبقاتِ متوسطا کا نام دیا جاتا ہے، ایسے ہیں کہ ان کی حدود متعین کرنا مشکل ہے اور نہ ان کی رکنیت کا ہی آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

مزید برآں جدید سماجی طبقوں کے سماجی عوامل بالخصوص ان کی رکنیت میں مسلسل رد و بدل ہو رہا ہے۔ کوئی فرد پیدائشی اعتبار سے کسی مخصوص سماجی طبقے کا اسی طرح ممبر بن جاتا ہے جس طرح کسی فرقے یا نظام جاگیرداری کے گروپ کا لیکن اس کا اپنی سماجی سطح پر قائم رہنا اتنا یقینی نہیں جتنا فرقے یا جاگیرداری پر مبنی سماجی سطح پر قائم رہنا کسی شخص کے لئے بربنائے پیدائش ممکن تھا۔ اس کی زندگی میں ہی اس کے والدین یا خود وہ سماجی رتبے کے اعتبار سے اوپر بھی اٹھ سکتے ہیں اور نیچے بھی گر سکتے ہیں۔ اگر وہ اوپر اٹھے گا تو اسے نہ تو شرافت کے کسی مخصوص تمغے کی ضرورت ہوگی نہ کسی سرکاری اعتراف کی۔ اس کے لئے صرف یہی کافی ہے کہ وہ امیر ہو جائے، کسی خاص اقتصادی فریضے کا اہل بن جائے اور جس سماجی طبقے میں اس کی رسائی ہو گئی ہے اس کی کچھ مخصوص ثقافتی خصوصیتوں کو اپنا لے۔

اگرچہ طبقوں کی اقتصادی بنیاد ایک بدیہی عمل ہے۔ لیکن اس واقعے کی تشریح مختلف طریقوں سے کی جا سکتی ہے اور یہ اختلاف سماجی زندگی میں طبقوں کے عوامل اور ان کے باہمی مراسم کے سلسلے میں ایسے نظریوں کے فروغ کا باعث بنتا ہے جن میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے لہٰذا یہ بات مفید ہوگی کہ ان تشریحات میں سے ایک تشریح کا جو مارکس نے کی ہے بغور مطالعہ کر لیا جائے۔ یہ تشریح طبقے کے اقتصادی پہلو پر انتہائی شدت سے زور دیتی ہے اور سماجی نظریے اور سیاسی سرگرمی

ان دونوں پر ہی اس کا غیر معمولی اثر پڑا ہے۔

بد قسمتی سے مارکس نے اپنے نظریۂ طبقات کو تفصیلی یا مربوط انداز سے پیش نہیں کیا اگرچہ یہ بات بجا طور پر کہی جا سکتی ہے کہ اس نے جو کچھ بھی لکھا وہ اسی موضوع سے متعلق تھا جس نقطے پر اس نے اپنے نظریات کو ایک مربوط طریقے پر پیش کرنا شروع کیا وہ نقطہ وہی ہے جہاں "سرمایہ" کی تیسری جلد کا مسودہ ایک صفحہ کے بعد جس میں اس نے اپنے نظریئے کے لئے کافی مشکلات پیدا کر لی ہیں، ختم ہو جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مارکس نے طبقے کے اسی تصور کو اپنا لیا تھا جو اس وقت، جب اس نے سماجیات کے متعلق اپنی تحقیقات کو شروع کیا، عمومی طور پر تسلیم شدہ تھا۔ اس کی بنیادی دلچسپی یہ تھی کہ اس تصور کو اپنے سماجی تبدیلی کے نظریئے کے وسیع تر ڈھانچہ میں استعمال کرے اور ایک مخصوص سماجی ہیئت یعنی جدید سرمایہ دارانہ نظام کے ارتقا کے تجزیئے میں اس سے فائدہ اٹھائے۔ اس نے اپنے ایک ابتدائی خط میں یہ بات خود ہی ظاہر کر دی تھی"...

جدید سماج میں طبقوں کا وجود دریافت کرنے کا کریڈٹ مجھے نہیں ملنا چاہیئے اور نہ ان کے درمیان جنگ کو دریافت کرنے کا ہی کوئی کریڈٹ مجھے مل سکتا ہے۔ مجھ سے بہت پہلے بورژوا مورخوں نے طبقوں کی اس جنگ کے تاریخی ارتقا کی تشریح پیش کر دی تھی اور بورژوا ماہرین اقتصادیات نے طبقوں کی اقتصادی تشریح"۔ مارکس نے اپنی کارکردگی یہ بتائی تھی کہ اس نے یہ دکھایا ہے کہ طبقات کا وجود نظام پیداوار کے ارتقا کے مخصوص تاریخی مرحلوں کے ساتھ وابستہ ہے اور یہ کہ جدید سماج میں طبقات کا تصادم محنت کش طبقے کی فتح اور ایک غیر طبقاتی سماج کے قیام پر منتج ہوگا۔

مارکس کے نظریئے کے بنیادی پہلو اس صورت میں یہ ہوئے کہ اس نے سماجی طبقوں کی تفصیل نظام پیداوار کی اصطلاحوں میں پیش کی ہے اور سماجی تصادم کے ذریعہ سماجی ارتقا کا نظریہ دریافت کیا ہے۔ مارکس کے بیان کے مطابق "جس چیز کو

دنیا کی تاریخ کہا جاتا ہے. وہ سب اس کے سوا کچھ نہیں کہ خود آدمی کی محنت سے آدمی کی تشکیل ہوئی ہے"۔ آدمی مادی اور ثقافتی مفہوم میں اپنی تشکیل بھی کرتا ہے اور تشکیل در تشکیل بھی کیونکہ" .... اپنی زندگی کی سماجی تخلیق میں آدمی وسائل پیداوار کے ساتھ جو ان وسائل کی مادی قوت پیداوار کے ارتقا کے ایک مخصوص مرحلے کے مطابق ہوتے ہیں، واضح رابطے قائم کرتا ہے۔ یہ رابطے ناگزیر ہوتے ہیں اور ان میں آدمیوں کے ارادے کو کوئی دخل نہیں ہوتا"۔ سماجی طبقوں کی ابتدا پیداواری قوتوں کی ترقی کا نتیجہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے تقسیم کار کا سلسلہ خاندانی حدود سے تجاوز کر جاتا ہے، دولت جمع ہونا شروع ہو جاتی ہے اور نجی جائداد عالم وجود میں آ جاتی ہے۔ اس کے بعد سماجی طبقے کی بنیاد آلات پیداوار (جن کی ملکیت نجی ہوتی ہے) کے ساتھ اس طبقے کا رابطہ ہوتا ہے۔ مارکس انسانی تاریخ کے اہم ادوار اور سماجی تنظیم کی متعدد اہم قسموں کے درمیان فرق بیان کرتا ہے۱۵۔ اس کا خیال تھا کہ ان مرحلوں میں ہر ایک مرحلے کی سیرت کو ایک مخصوص طریقۂ پیداوار اور ان سماجی مراسم (بالخصوص جائداد اور طبقاتی مراسم) نے جو اس طریقۂ پیداوار کے ماتحت عالم وجود میں آئے، متعین کیا تھا۔ ایک قسم کے سماج کی

۱۵۔ معاشیات کی تحقیق پر مقالہ کے دیباچے میں مارکس لکھتا ہے:" ایک خاکے کے طور پر ہم ایشیائی قدیم جاگیردارانہ اور جدید بورژوائی طریقہ ہائے پیداوار کو سماج کی اقتصادی تشکیل کے ارتقا کے اہم مرحلوں کا نام دے سکتے ہیں"۔ ایک اور جگہ اس نے اور اینگلز نے ابتدائی کمیونزم، قدیم سماج (غلامی) جاگیردارانہ سماج (رعیت) اور سرمایہ داری (اُجرتی محنت) کو انسان کی تاریخ کے بنیادی مرحلوں کا نام دیا ہے۔ مارکس کی زبان سے سماج کے ایشیائی نظام کا ذکر دلچسپ ہے کیونکہ یہاں بظاہر وہ یہ تسلیم کر لیتا ہے کہ اس معاملہ میں حکمران طبقہ صرف بیوروکریسی بھی ہو سکتا ہے۔

دوسری قسم کے سماج میں تاریخی تبدیلی طبقاتی جنگ اور ایک طبقے کے دوسرے طبقے پر غالب آجانے کا نتیجہ ہوتی ہے۔

طبقاتی کشمکش بجائے خود مختلف طریقہ ہائے پیداوار کے تضاد کی آئینہ دار ہوتی ہے اور ایک مخصوص طبقہ کی ظفرمندی اور اس طبقے کا سماج کی از سر نو تشکیل کرنا ایک نئے اور بہتر طریقۂ پیداوار کے عالم وجود میں آنے پر منحصر ہوتا ہے اور یہ بات اس طبقے کے مفاد میں ہوتی ہے کہ وہ اس طریقۂ پیداوار کی برتری کو مسلّط کر دے۔ مارکس کے لفظوں میں "کوئی سماجی نظام اس وقت تک معدوم نہیں ہوتا جب تک، وہ تمام تخلیقی قوتیں جن کی اس میں گنجائش ہے نقطۂ تکمیل کو نہیں پہنچ جاتیں"۔

لیکن مارکس ٹیکنیکلی یا اقتصادی جبریت پر اندھا عقیدہ نہیں رکھتا تھا۔ اس کے برعکس وہ یہ بھی مانتا تھا کہ "آدمی اپنی تاریخ خود بناتے ہیں"۔ اسے پختہ یقین تھا (اور واقعہ یہ ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کی اپنی کوشش احمقانہ ہوتی) کہ ایک طبقہ کی ظفرمندی کا انحصار اس کے اپنی حیثیت اور اپنے مقاصد سے آگاہ ہونے اور اس کی اپنی تنظیم پر اتنا ہی ہے جتنا اس کی ماحولی اقتصادی حیثیت پر۔ اس نے ان عناصر سے متعدد بار بحث کی جو طبقاتی احساس کی نشوونما میں ممد یا مزاحم ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر پرودھن کے جواب میں اس نے "فلسفے کا افلاس" کے نام سے جو کتابچہ لکھا ہے اس میں پرولتاری طبقے کی نشوونما پر طویل بحث کے بعد وہ اس بات پر احتجاج کرتا ہے کہ اس نشوونما کو مناسب توجہ کا مستحق نہیں سمجھا گیا اور اسے نظرانداز کیا جا رہا ہے۔ وہ لکھتا ہے "کمیون سے گزر کر ایک طبقہ بننے میں بورژوازی جن تاریخی مراحل سے گزری ہے ان کی نشاندہی کے لئے متعدد تحقیقاتیں کی گئی ہیں۔ لیکن مزدور طبقہ جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہڑتالوں تنظیموں اور دیگر ذرائع سے ایک باقاعدہ طبقے کی حیثیت سے تشکیل پا رہا ہے۔ اس نے بعض لوگوں کو

تو ایک جائز قسم کے خوف میں مبتلا کر دیا ہے اور بعض صرف ماورائی حقارت کا مظاہرہ کر کے اسے مستحق توجہ سمجھنے ہی سے انکار کر رہے ہیں۔" پرولتاری طبقے کی ظفرمندی کے متعلق مارکس کی پیشگوئی زیادہ تر اس کے اس مفروضے پر مبنی تھی کہ محنت کش طبقے کی تنظیم اور اس میں طبقاتی احساس کی نشوونما کے لئے پیداوار کے جدید کارخانوں کا ماحول زیادہ سازگار تھا۔

مارکس نے تفصیلی تجزیہ صرف ایک قسم کے سماج کا کیا۔ یہ انیسویں صدی کا سرمایہ دارانہ سماج تھا۔ اس مقصد کے لئے بھی اس نے زیادہ تر ایک ہی ملک یعنی برطانیہ کو منتخب کیا۔ اس دور اور اس جگہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کا نظریہ انتہائی معقول تھا۔ برطانیہ کی صنعتی نشوونما مارکس کے اس دعوی کی بظاہر تائید کر رہی تھی کہ سماج قطبی میلان پیدا کر کے دو بنیادی طبقوں میں بٹ رہا ہے۔ ایک سرمایہ داروں کا مختصر سا طبقہ جو امیر سے امیر تر ہو رہا تھا اور دوسرا جائداد سے محروم اور مفلس صنعتی مزدوروں کا طبقہ جس کی تعداد مسلسل بڑھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی متوسط طبقے جن سے مارکس کی مراد چھوٹے آزاد کارخانہ دار اور لبرل پیشوں کے افراد تھے معدوم ہو رہے تھے اور اُجرتی مزدوروں میں تبدیل ہو رہے تھے مزید برآں مزدور تحریک (ٹریڈ یونینیں کواپریٹیو ادارے اور سوشلسٹ سیاسی پارٹیاں) کا عروج اور اس دور کی انقلابی کشمکشیں بالخصوص ۱۸۴۸ء اور اس سے چند برس پہلے کی انقلابی کشمکشیں مارکس کے جائزے کی تائید کرتی نظر آتی ہیں۔ اس جائزے کے مطابق پرولتاری طبقے کی تنظیم اور طبقاتی احساس کی نشوونما کا آخری مرحلہ ایک ایسی جدوجہد تھی جو سرمایہ دارانہ نظام کا تختہ اُلٹ دے گی۔

مارکس کے نظریئے پر باقاعدہ تنقید کیلئے یہ جگہ موزوں نہیں[1]۔ یہاں صرف یہ کافی ہوگا کہ

---

[1] مارکس کے سماجی نظریئے کے متعدد تنقیدی جائزے موجود ہیں جن میں چند ایک کے نام یہ ہیں:۔ جی۔ ڈی۔ ایچ کول کی کتاب "مارکسیت کا مفہوم"۔ آر۔ این۔ کریو ہنٹ کی کتاب "کمیونزم۔ نظریہ اور عمل"۔ جون پلامی ناٹز کی کتاب "جرمن مارکسزم اور روسی کمیونزم"۔ جوزف شومپیٹر کی کتاب "سرمایہ داری، سوشلزم اور جمہوریت"۔ ان کتابوں کا تا حال اردو میں ترجمہ نہیں ہوا۔

اس کے طبقاتی نظریئے پر چند عمومی اعتراض قلمبند کر دیئے جائیں اور بعد کے چند واقعات کی روشنی میں اس کی چند مخصوص پیشگوئیوں کا جائزہ لے لیا جائے۔

مارکس نے ساری انسانی "تاریخ کی توضیح طبقات اور طبقاتی کشمکشوں کی اصطلاح میں کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس طرح اس نے بعض دوسرے اہم سماجی گروہوں بالخصوص قوموں کو نظر انداز کر دیا۔ اس کوتاہی نے اس کے سماجی ارتقا کے بیان میں دو اہم نقائص پیدا کر دیئے اول یہ کہ نیشنلزم اور بین الاقوامی کشمکش انیسویں صدی کے وسط میں خواہ نسبتہً غیر اہم ہی نظر آتی ہو لیکن دنیا کی تاریخ کے مکمل جائزے میں ان کے نتائج کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے مطالعے میں تو انھیں ہرگز ہی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دوئم یہ کہ مارکس نے ہر قوم کے اندر طبقاتی تضاد کے بیان میں مبالغے سے کام لیا اور ایک قوم کی یکرنگیت اس تضاد میں جو اعتدال پیدا کرتی ہے اسے نظر انداز کر دیا۔ ایک بار پھر یہ بتانا ضروری ہے کہ انیسویں صدی کے وسط میں اس غلطی کا ارتکاب آسانی سے کیا جا سکتا تھا۔ "دو قومیں" صرف برطانیہ ہی میں موجود نہیں تھیں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی انکی نشاندہی کی جا سکتی تھی۔ ان میں سے ایک قومی امور کی رہنمائی کرتی تھی اور اس میں سرگرم حصہ لیتی تھی اور دوسری پالیسی کے لئے صرف خام مواد کا کام دیتی تھی۔

لیکن اس وقت کے بعد سے تمام ترقی یافتہ صنعتی ملکوں میں سیاسی اور سماجی حقوق کی مسلسل توسیع ہوئی ہے۔ یہ توسیع متشددانہ انقلاب کے بغیر ہوئی ہے اور زیادہ تر مراعات یافتہ طبقہ کی رضامندی سے۔ ماضی کے تمام سماجوں کی طرح طبقاتی مفاد اور طبقاتی کشمکش موجودہ سماج کے بھی مستقل پہلو ہیں لیکن مشترکہ انسانی مفاد اور سماجی انصاف کے آدرش ان پر مسلسل اثر انداز ہو رہے ہیں۔ سماجی ارتقا کے متعلق مارکس کا نظریہ انسانی مراسم میں صرف کشمکش اور ایک ہی قسم کی کشمکش پر زور دیتا ہے۔ اس کی اصلاح کے لئے ایک وسیع تر نقطہ نظر کی ضرورت ہے جو کشمکش کی دوسری قسموں کو بھی ملحوظ رکھے اور سماجی تبدیلی کے ان پُر امن

عوامل کو بھی جو کسی طرح کم اہم نہیں۔ ان عوامل میں استدلالی علم اور ایک عالمگیر اخلاق کی نشوونما انتہائی اہم ہیں جیسا کہ ایل۔ ٹی۔ ہاب ہاؤس نے بجا طور پر زور دیا ہے۔

مارکس نے سماجی درجہ بندی کی نوعیت کے بیان میں بھی غیر معمولی اختصار سے کام لیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سرمایہ دارانہ سماج کی نشوونما کا جو بیان اس نے پیش کیا ہے اس کے لئے دو بنیادی اور متصادم طبقوں کا وجود ضروری تھا لیکن ایک ترقی یافتہ صنعتی سماج میں سماجی درجہ بندی اتنی سادہ ہرگز نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس ان سماجوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں متعدد لطیف امتیازات اور سماجی درجے ہوتے ہیں جو ایک انتہائی پیچیدہ درجہ بندی کا باعث بنتے ہیں اور مختلف طریقوں سے طبقات کے باہمی مراسم میں اعتدال پیدا کرتے ہیں۔[1]

وسیع متوسط طبقوں کا وجود اس کا نمایاں ثبوت ہے۔ "نئے متوسط طبقے" جن سے مراد دفتروں میں کام کرنیوالے اور چھوٹے چھوٹے پیشہ ورانہ کام کرنیوالے لوگ ہیں۔ مارکسی مفہوم میں ایک علیحدہ طبقہ ہرگز نہیں ہیں۔ یہ پرولتاری ہیں جو اپنی قوت محنت بیچ کر زندگی بسر کرتے ہیں لیکن مارکسی نظریئے کی بدنصیبی یہ ہے کہ ان کا طرز عمل پرولتاری جیسا نہیں ہوتا۔ وہ طبقاتی احساس نہیں رکھتے۔ ان کی بنیادی دلچسپی اس بات سے ہوتی ہے کہ وہ سماج میں اپنا سر بلند رکھیں اور اگر ہو سکے تو دوسروں سے آگے نکل جائیں۔ اقتصادی بدحالی کے دور میں ان کی تمام تر کوشش اس پر مرکوز ہوتی ہے کہ وہ اپنی سطح سے گر کر پرولتاریوں کی صف میں شامل نہ ہو جائیں۔ بلحاظ تعداد ان کی اہمیت اتنی ہے کہ کوئی بھی جمہوری سیاسی پارٹی انھیں نظر انداز نہیں کر سکتی۔ مارکس نے جس پرولتاری انقلاب کا تصوّر باندھا تھا

---

[1] اپنی سیاسی تحریروں مثلاً "لوئی بونا پارٹ کے انقلابی کیلنڈر کی اٹھارویں برومیئر" میں وہ تقریباً دس طبقات کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن اس نے ان گروہوں اور دو بنیادی طبقوں کے باہمی مراسم کا سنجیدگی سے تجزیہ نہیں کیا۔

وہ اب ممکن نہیں۔ بشرطیکہ اس انقلاب سے ایک ایسا انقلاب مراد ہو جو ایک بڑی اکثریت کے مفادکے لئے بڑی اکثریت کی طرف سے برپا کیا جائے۔

مزید برآں یہ بات بھی اہم ہے کہ بہت سے صنعتی سماجوں میں خود مزدور طبقہ بھی مارکسی نظریئے کے پرولتاری طبقے کے ساتھ کچھ زیادہ مماثلت نہیں رکھتا۔ جدید مزدور طبقہ بیشتر صورتوں میں نہ ہم رنگ ہے، نہ طبقاتی احساس رکھتا ہے اور نہ انقلابی گروپ ہے۔ بڑھتے ہوئے معیارِ زندگی اور تعلیم کے بہتر مواقع نے اس کی طرزِ زندگی کو متوسط طبقے کی طرزِ زندگی کے زیادہ سے زیادہ مماثل بنا دیا ہے۔ جی۔ بریف مزدور طبقے کے ارتقا کے مطالعے میں پرولتاری طبقے کو "نئے متوسط طبقوں" یعنی سفید پوش مزدوروں سے اس بنا پر ممیز کرتا ہے کہ اسے اپنی زندگی میں معاشی اطمینان حاصل نہیں ہوتا۔ پرولتاری ایک ایسا فرد ہے جس کی "آمدنی کا واحد یا کم سے کم ناگزیر ذریعہ اس کی قوت محنت کی فروخت ہے۔ یہ فروخت محنت کی ایک ایسی منڈی میں کی جاتی ہے جو تغیر پذیر اور غیر محفوظ ہے"

غالباً یہی معاشی بے یقینی اور قوم کی ثقافتی زندگی سے علیحدگی مارکس کے ذہن میں بھی تھی۔ جب اس نے پرولتاری طبقے کا ذکر اس طرح کیا: "مہذب سماج کا ایک ایسا طبقہ جو مہذب سماج کا طبقہ نہیں ہے" لیکن مزدور طبقے کی زندگی کا یہی پہلو ایسا ہے جو بیسویں صدی میں سب سے زیادہ تبدیل ہوا ہے۔ اس تبدیلی کا باعث ٹریڈ یونین ازم، مشترکہ معاہدے، سوشل انشورنس، فلاحِ عامہ کے شعبے، پوری ملازمت، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی سہولتیں اور چھوٹی چھوٹی بچتوں کے اندوختے سے پیدا ہونے والے اثرات ہیں۔ غالباً فرانس اور اٹلی میں ایک پرولتاری طبقے کا ٹکسالی مفہوم میں اب تک وجود ہے اور اس کے مطابق ہی ایک شدید طبقاتی جدوجہد بھی وہاں پائی جاتی ہے لیکن دوسرے ملکوں مثلاً برطانیہ، امریکہ اور سکینڈے نیویا کے ممالک میں پرولتاری طبقے کا ان معنی میں وجود مشکل ہی سے ملے گا۔

کم سے کم یہ بات سبھی کو حتیٰ کہ "راسخ العقیدہ" مارکسیوں کو بھی تسلیم کرنے کے لئے تیار

رہنا چاہیے کہ ان افلاس زدہ اور ناخواندہ افراد کا طبقہ جنھیں ۱۸۴۸ء میں برطانیہ کے گندے صنعتی شہروں میں جمع کر دیا گیا تھا اور جن کی مصیبتوں کی کارل مارکس نے (بلکہ متعدد دوسرے سوشلسٹ اور سماجی مصلحین نے بھی) بجا طور پر مذمت کی تھی۔ اس طبقہ سے بنیادی طور پر مختلف تھا جس کے بیشتر ممبر اب ان مکانوں کے مالک ہیں جن میں وہ رہ رہے ہیں، جن کے پاس ایسے مادی وسائل ہیں جو انھیں بہتر اور رنگارنگ زندگی کے مواقع مہیا کر دیتے ہیں جو اپنے بچوں کو اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں بھیج سکتے ہیں اور اپنی قوم کی سماجی اور تہذیبی زندگی میں شرکت کے زیادہ سے زیادہ اہل بن رہے ہیں۔ موجودہ دور کی بیشتر صنعتی سماجوں میں مزدور طبقہ ان معنوں میں طبقاتی احساس اب بھی رکھتا ہے کہ وہ سوشلسٹ سیاسی پارٹیوں کا حامی ہے اور جب تک دولت کی بڑی بڑی نابرابریاں جن کا ذاتی کوشش سے کوئی تعلق نہیں، باقی رہیں گی، یہ صورت حال موجود بھی رہے گی لیکن مزدور طبقہ اب انقلابی ہرگز نہیں کیونکہ اب اس کے پاس گنوانے کے لئے زنجیریں ہی نہیں اور بھی بہت کچھ ہے۔

آیئے اب ہم مارکس کی چند مخصوص پیشگوئیوں کا مختصر سا جائزہ لیں۔ جو عمل سرمایہ داری کا تختہ الٹ کر پرولتاریہ کی حکومت قائم کر دیگا اس کی جو تشریح مارکس نے کی ہے۔ وہ نہ تو منطقی اعتبار سے قطعی ہے اور نہ اس کی تمام تحریروں میں اس کا تسلسل پایا جاتا ہے۔ جن عناصر پر اس کا انحصار تھا ان میں مندرجہ ذیل عناصر خصوصیت سے اہم تھے:۔ سرمائے کا ارتکاز جو خود سرمایہ داروں کے اندر بھی ایک مختصر سے گروہ کے ہاتھ میں پہنچ جائیگا۔ مشینری کے ارتقاء کی وجہ سے پرولتاری طبقے کی حیثیت گھٹتے گھٹتے اتنی رہ جائے گی کہ وہ ایک یکرنگ اور نا تربیت یافتہ مزدوروں کا مجموعہ بن جائے گا۔ پرولتاری طبقے کی بڑھتی ہوئی مصیبت۔ متوسط طبقوں کا کالعدم ہونا جن کے بیشتر ممبر مجبوراً پرولتاری طبقے میں پہنچ جائیں گے۔ یہ ثابت کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں کہ مارکس نے جن واقعات کی پیشگوئی کی تھی۔ ترقی یافتہ صنعتی سماجوں میں ان میں سے کوئی بھی رونما نہیں ہوا۔ صنعت کا ارتکاز ضرور ہوا ہے اور پیداوار اور کنٹرول

کے بڑے بڑے یونٹ بھی عالم وجود میں آ گئے ہیں لیکن اس کا نتیجہ ملکیت کا ارتکاز نہیں ہوا بلکہ یہ پھیل گئی جس کی بڑی وجہ جائنٹ سٹاک کمپنیوں کا فروغ ہے۔ ملکیت کے اس پھیلاؤ کے بیان میں مبالغہ نہیں کرنا چاہیئے مثلاً اندازہ لگایا گیا ہے کہ برطانیہ میں علیحدہ آمدنیاں رکھنے والوں کی مجموعی تعداد میں سے صرف پانچ فیصدی پبلک کمپنیوں کے حصہ دار ہیں۔ اس کے علاوہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ صنعت کی ملکیت کے وسیع تر پھیلاؤ کے باوجود اس کا کنٹرول افراد کی ایک قلیل تعداد کے ہاتھ میں ہو لیکن یہ مسئلہ ایسے سوالوں کو سامنے لاتا ہے جو مارکس کے تجزیئے کی حدود سے باہر ہیں کیونکہ مارکس نہ تو صنعت کی ملکیت اور اس کے کنٹرول میں کوئی باقاعدہ امتیاز کرتا ہے اور نہ خود "ملکیت" کے تصور کا ہی قریبی جائزہ لیتا ہے[۵۱]۔

پرولتاری طبقے کی حیثیت مبتذل نہیں ہوئی اور وہ ناتربیت یافتہ مزدوروں کا ایک یکرنگ مجموعہ نہیں بنا۔ اس کے برعکس مشینیت کے روز افزوں فروغ کے باوجود تمام ترقی یافتہ صنعتی ملکوں میں نئی نئی مہارتوں کی افراط ہو گئی ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ میں ۱۹۱۰ء میں مجموعی مزدور آبادی میں ناتربیت یافتہ مزدوروں کا تناسب ۵ء ۲۱ فیصدی تھا لیکن ۱۹۴۷ء میں یہ تناسب گھٹ کر ۶ء ۱۵ فیصدی رہ گیا۔ یہ ثابت کرنا بھی کسی طرح ممکن نہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام میں مزدوروں کی مصیبتوں میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا ہے جیسا کہ آئندہ باب میں میں بہ تفصیل بیان کرونگا۔ مجموعی قومی پیداوار میں اضافہ کے ساتھ ساتھ مزدور طبقے کا معیار زندگی متواتر بلند ہوا ہے۔ آخری بات یہ کہ بہت سے ملکوں میں "پرانے متوسط طبقے" ختم ہو گئے ہیں لیکن ان کی جگہ بے شمار نئے متوسط طبقوں

---

۵۱ کاٹسکی نے مارکس کی تحریروں کا جو مجموعہ شائع کیا ہے۔ اس میں ۱۸۶۰ء کی ایک تحریر میں مارکس سرمایہ دار اور مینیجر کے منصب کی علیحدگی پر بھی بحث کرتا ہے اور جائنٹ سٹاک کمپنیوں کے فروغ پر بھی لیکن اس تحریر سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اسے ان تبدیلیوں کے اہم سماجی اثرات کا بھی احساس تھا۔

نے لے لی ہے۔ پرانے متوسط طبقوں کا زوال مزدور طبقے کی صفوں میں اضافے کا باعث نہیں ہوا۔ مارکس نے متوسط طبقے میں صنعتی اور زرعی شعبوں میں آزادانہ پیداوار کرنے والوں اور لبرل پیشے اختیار کرنیوالوں کو شامل کیا تھا۔ چھوٹے پیمانے پر پیداوار کرنے والوں کی تعداد وسیع پیمانے کی صنعت کے فروغ کی وجہ سے بیشتر ملکوں میں کم ضرور ہوگئی ہے لیکن مارکس کی پیشگوئی کے مطابق ایسا تمام ملکوں میں نہیں ہوا۔ سفید پوشی والے پیشے جن میں نئے پیشے اور ضمنی پیشے بھی شامل تھے، مارکس کی نظر میں تو ضرور تھے لیکن ان کی اہمیت اس کی نگاہوں سے اوجھل رہی وہ ان تبدیلیوں کا اندازہ نہ لگا سکا جو اس قسم کے پیشہ وروں کی تعداد میں اضافہ سے ان کے اندازِ نظر اور طرزِ عمل میں پیدا ہوں گی۔

میں نے مارکس کے نظریئے سے کسی قدر تفصیلی بحث کی ہے۔ صرف اس لئے نہیں کہ یہ نظریہ موثر ہے بلکہ اس لئے بھی کہ اس کے تنقیدی جائزے سے سماجی طبقے کے بہت سے اہم پہلو سامنے آجاتے ہیں بعض مروجہ آرا کے برعکس مارکس ہمیشہ غلط نہیں ہوتا تھا۔ اگر اس کا طبقاتی نظریہ آج ناقص نظر آتا ہے تو اس کی وجہ جزواً یہ ہے کہ سماج نے ایک ایسی سمت ترقی کی ہے اور اس میں ایسی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ جن کی وہ یقیناً تائید کرتا سماج نے مساوات کی طرف قدم بڑھائے ہیں اور اس طبقے کی بہتری اور اصلاح کی طرف بھی جو مارکس کے زمانے میں اقتصادی اور سیاسی طور پر بے بس بھی تھا اور ناجائز انتفاع کا شکار بھی۔

بیشتر جدید صنعتی سماجوں کے طبقاتی نظام کے ڈھانچے کو جو چیز متشکل کرتی ہے وہ جائداد، بالخصوص آلاتِ پیداوار کی ملکیت کی تقسیم ہے لیکن ترقی یافتہ صنعتی سماجوں میں جو سماجی درجہ بندی اس طرح متشکل ہوتی ہے اس میں ترمیم بھی ہوئی ہے اور پیچیدگیاں بھی پیدا ہوئی ہیں اول یہ کہ ملکیتی مراسم میں اہم تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ صنعتی ملکیت کا کافی وسیع پیمانے پر پھیلاؤ ہوا ہے جبکہ اس کا کنٹرول چند ہاتھوں میں مرتکز ہوگیا ہے

یا اگر ایسا نہیں تو یہ ہوا کہ صنعتی ملکیت اور اس کا کنٹرول مختلف ہاتھوں میں پہنچ گئے ہیں اس طرح وسائل پیداوار کی ملکیت طبقاتی حکومت کی زیادہ اہم بنیاد نہیں رہی۔ اس کے ساتھ ہی قانون کے ذریعہ حقوق ملکیت کو بھی مسلسل اور متواتر محدود کیا گیا ہے۔ دوئم یہ کہ سماجی مرتبے کی ایک نئی درجہ بندی سامنے آگئی ہے جس کی بنیاد جائداد پہ نہیں بلکہ تعلیم ذاتی تکمیل اور ذاتی اہلیتوں پہ ہے۔ یہ واقعہ نئے متوسط طبقوں کے فروغ کا نتیجہ ہے سوم سماجی رتبے میں ادل بدل کے امکانات میں جو اضافہ ہو رہا ہے اس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ نئی سماجی درجہ بندی اس درجہ بندی کے زیادہ سے زیادہ قریب تر ہوتی جائے جو مختلف قسم کی قدرتی اہلیتوں پر مبنی ہوتی ہے۔ ماضی کے سماجوں کے مقابلے میں آجکل کے جمہوری سماجوں میں ایسے فنکاروں کی تعداد بہت کم ہے جنھیں ماحول کے جبر نے گمنامی اور سکوت پہ مجبور کر دیا ہو۔ ایسے سائنسداں اور منتظم بھی اس دور میں نسبتاً کہیں کم ہیں جن کی امکانی اہلیتوں کی قدر نہ ہوئی ہو۔ چہارم یہ کہ سماجی درجہ بندی کے انتہائی کناروں کا درمیانی فاصلہ اب بلحاظِ دولت بھی اور بہ لحاظِ رتبہ بھی پہلے سے بہت کم ہو گیا ہے۔ سماج کا اونچا طبقہ اب نہ ایک صدی پہلے کی طرح اتنا امیر ہے نہ اتنا رعونت کیش اور نہ نچلے طبقے ہی ایک صدی پہلے کی طرح اتنے مفلس اور فرد مایہ ہیں۔

کمیونسٹ اور جمہوری سماجوں میں طبقات کا وجود

اس وقت تک کسی مغربی جمہوری ملک نے غیر طبقاتی سماج کے حصول کو اپنی سماجی پالیسی کا مقصد قرار نہیں دیا۔ دوسری طرف یہ کمیونسٹ سماجوں کا سرکاری طور پر علانیہ مقصد ہے لہذا ان دو مختلف قسم کے سماجوں کے موجودہ ڈھانچے اور ان کی نشوونما کے رجحان کا ان کے اپنے اپنے سماجی فلسفوں اور پالیسیوں کی روشنی میں مطالعہ کافی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ جمہوری سماج متعدد اور مختلف النوع ہیں۔ میں ان میں سے صرف دو یعنی برطانیہ اور امریکہ کا تفصیلی جائزہ لوں گا باقیوں کا ذکر صرف سرسری کیا جائیگا۔ کمیونسٹ سماجوں کے معاملے میں مشکل مختلف نوعیت کی ہے۔ ان میں سے بیشتر حال ہی میں عالم وجود میں آئے ہیں اور ان کے سماجی ڈھانچے کے متعلق قابل اعتماد معلومات بہت کم ہیں اس وجہ سے میں نے اپنے مطالعے کو صرف سوویٹ یونین تک ہی محدود رکھا ہے۔

برطانیہ

برطانیہ کو انیسویں صدی میں بسا اوقات طبقاتی سماج کا ایک مثالی نمونہ سمجھا گیا ہے۔ مارکس نے اسے سرمایہ داری اور نئے سماج میں دو بنیادی طبقوں یعنی بورژوائی اور پرولتاری طبقوں کی نشوونما کے بیان میں نمونے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ڈزرائیلی نے بھی جو ایک انقلابی ہرگز نہیں تھا۔ برطانیہ میں "دو قوموں" کی ہم وجودیت کو محسوس کیا اور ان نتائج سے خبردار کیا۔ جو قوم کے اندر اس گہرے اختلاف کی خلیج سے پیدا ہو سکتے ہیں میتھیو آرنلڈ نے اعلان کیا کہ برطانیہ میں نابرابری تقریباً تقریباً ایک مذہب کا درجہ رکھتی ہے۔ برطانیہ کے طبقاتی امتیازات کی شدت اور "معیار شرافت" کا کٹر پن غیر ملکی مبصروں کو حیرت میں ڈال

دیتا تھا۔ ان کے نزدیک برطانوی امارت پرستی کی خصوصیات کو برقرار رکھنے والی یہی چیزیں تھیں کھیل کے انگریزی مترادف SPORT کی طرح امارت پرست کا مترادف SNOB بھی ایک مخصوص مفہوم کا حامل ہے اور یہ دونوں لفظ برطانیہ کی دین ہیں۔ آر۔ ایچ ٹانیئے کے بیان کے مطابق برطانوی طبقاتی نظام کی قوت کا راز "امیروں کی حکومت کی ناحہذب حقیقت اور اشرافی روایت کی جذباتی جھک، کے امتزاج" میں مضمر ہے۔

یہ نظام بیسویں صدی میں کس حد تک برقرار رہ سکا ہے؟ جائداد اور آمدنی کی تقسیم میں جو تبدیلیاں ہوئیں ہیں انھوں نے امیروں کی حکومت کی حقیقت کو بہت بڑی حد تک بدل دیا ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر تک عام معیار زندگی میں مسلسل اصلاح کے باوجود افلاس ہمہ گیر تھا۔ چارلس بوتھ نے ۱۸۸۷ء اور ۱۸۹۱ء کے درمیانی عرصہ میں لندن کا جو جائزہ[۵] لیا تھا اس کے مطابق اس شہر کی آبادی کا تیس فیصدی حصہ افلاس کی زندگی بسر کر رہا تھا۔[۵] بی سیبوہم رونٹری[۲] نے یارک کا جو مطالعہ ۱۸۹۹ء میں شروع کیا اس سے بھی اسی قسم کے نتیجے مرتب ہوتے تھے۔ سماجی درجہ بندی کے دوسرے کنارے پر ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۳ء کے درمیان صورتِ حال یہ تھی کہ ایک فیصدی آبادی تمام نجی جائداد میں سے ۶۸ فیصدی جائداد کی مالک تھی اور مجموعی قومی آمدنی کا ۲۹ فیصدی حصّہ وصول کرتی تھی۔

اقتصادی نابرابری پر حملہ حال ہی میں شروع ہوا ہے۔ جائداد پر ڈیوٹی سب سے پہلے انیسویں صدی کے اواخر میں لگائی گئی۔ اس کی شرح قابل قدر حد تک ۱۹۴۹ء میں ہی پہنچی جو دس لاکھ سے زائد کی جائدادوں کیلئے اسی فیصدی تھی۔ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۷ء تک تمام نجی جائدادوں کے نصف حصّے کا مالک آبادی کا ایک فیصدی حصہ ہی تھا۔

مزید برآں یہ بات آسانی سے ثابت کی جاسکتی ہے کہ اسی فیصدی کی ڈیوٹی بھی بڑی

۵؎ "لندن میں عوام کی زندگی اور محنت کا ماحول"

۵۲؎ بی سیبوہم رونٹری کی کتاب "افلاس، شہری زندگی کا ایک مطالعہ"

بڑی جائدادوں (اور اس طرح بے کمائی آمدنیوں) میں کمی آہستہ آہستہ ہی کرتی ہے۔ پھر وراثت حاصل کرنے والے کی زندگی کے دوران ہی اس دولت کی جزوا بحالی کے امکانات بھی ہیں۔ اس طرح مساوات کے حامیوں کی طرف سے بہت بڑی جائدادوں پر ڈیوٹی کی زیادہ اونچی شرح کا جو مطالبہ کیا جاتا ہے وہ کافی ٹھوس ہے۔

آمدنی کی تقسیم جدید، دولت کے مقابلے میں زیادہ دور تک گئی ہے جو زیادہ تر بھاری اور غیر معمولی درجہ وار ٹیکسوں کا نتیجہ ہے ٹیکسوں کا جو اثر ہوا ہے اسے مختصراً اس طرح ظاہر کیا جاسکتا ہے کہ مختلف ادوار میں آمدنیوں کے جو حصے بطور ٹیکس ادا کئے گئے ہیں ان کا موازنہ کر لیا جائے۔

کمائی ہوئی آمدنی (پونڈوں میں)	ٹیکسوں میں دی گئی آمدنی کا تناسب ۱۹۱۳ تا ۱۹۱۴	۱۹۳۸	۱۹۴۸
۵۰۰ تا ۹۹۹	※ ۴٫۴	۸٫۸	۱۴٫۶
۲۰۰۰ تا ۹۹۹۹	※ ۹٫۴	۲۹٫۱	۴۴٫۶
۱۰۰۰۰ اس سے زائد	※ ۸	۵۶٫۵	۷۵٫۸

(※ اس فیصدی تناسب کا تعلق آمدنی کی نچلی سطحوں سے ہے)

اس طرح آمدنی کے مختلف مدارج کا فرق کافی حد تک کم ہوگیا ہے۔ جو آمدنیاں چھ ہزار پونڈ سے اوپر تھیں ان کی تعداد ٹیکس کی ادائیگی کے ایک سال بعد بہت ہی کم رہ گئی ہے۔ ۱۹۳۸ء میں سب سے اونچی آمدنی (دس ہزار پونڈ یا اس سے زیادہ) والے گروپ کی اوسط برقرار آمدنی دو سو پچاس پونڈ یا نو سو ننانوے پونڈ کی آمدنی والے گروپ سے اٹھائیس گنا تھی۔ لیکن ۱۹۴۸ء میں یہ صرف تیرہ گنا رہ گئی۔

رؤنٹری اور بوتھ دونوں نے ہی اپنی تحقیقاتوں کے دوران یہ محسوس کیا تھا کہ افلاس کے دو اہم ترین اسباب بیکاری اور خرابی صحت تھے۔ زمانۂ بعد از جنگ کے برطانیہ

میں آمدنیوں میں جو یکسانیت پیدا ہوئی ہے اس کی ایک وجہ تو سب کے لئے ملازمت کا لازمی اصول ہے اور دوسری بہبودِ عامّہ کی کارروائیاں۔[1] لیکن مفادِ عامّہ کی کارروائیوں نے طبقاتی نابرابریوں کو کم کرنے پر جو اثر ڈالا ہے اس کی اہمیت صرف ایک اقتصادی اثر سے زیادہ ہے۔ اول اس لئے کہ جیسا کہ آر۔ ایچ ٹانیئے نے دلیل پیش کی ہے "چند شدید اور حوصلہ شکن معذوریاں مثلاً زندگی کا ایسا ماحول جو صحت کے لئے خطرناک ہو، ناقص تعلیم اور معاشی بے اطمینانی" ایسی ہیں جو ان طبقوں کو جنھیں ان کا تجربہ ہوتا ہے۔ ان طبقوں کے مقابلے میں جنھیں ان معذوریوں کا سامنا نہیں ہوتا مستقل طور پر گھاٹے میں رکھتی ہیں مفادِ عامّہ کی کچھ کارروائیاں ایسی ہیں جنھوں نے ان معذوریوں کی شدّت کو بہت بڑی حد تک کم کر دیا ہے اور اگر اُن کا سلسلہ جاری رہا تو ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب وہ ان معذوریوں کو بالکل ہی ختم کر دیں گی۔ مفادِ عامّہ کی ان موثر کارروائیوں نے برابری قائم کرنے میں جو حصّہ ادا کیا ہے وہ بہت زیادہ ہے اور بدیہی طور پر نمایاں! اگر مفادِ عامّہ کی ان کارروائیوں کی مجموعی لاگت کو ان سے فائدہ اُٹھانے والے چار کروڑ اشخاص پر مساوی تقسیم کر کے ہر شخص کو اس کے حصّے کی سالانہ ادائیگی کر دی جاتی تو اتنے اچھے نتائج ہرگز مرتب نہ ہوتے۔[2] دوم اس لئے کہ مفادِ عامّہ کے ان اداروں سے چونکہ سبھی شہری مستفید ہوتے ہیں اس لئے انھوں نے مساوات کا ایک نیا ماحول پیدا کر دیا ہے۔ قومی ہیلتھ سروس اس معاملے میں کامیاب ہو ہی چکی ہے۔ جب ۱۹۴۴ء کے تعلیمی ایکٹ کے مطابق قومی نظامِ تعلیم کی تکمیل ہو جائیگی تو اس سلسلے میں اہم تر نتائج مرتب ہونگے۔ بچپن اور نوجوانی میں مشترکہ تجربات اور مشترکہ تمدّن میں شرکت برطانوی سماج کے طبقاتی

---

[1] رونٹری نے یارک کے تیسرے سماجی سروے میں اس بات پر زور دیا ہے۔ بی۔ سیبوہم رونٹری اور جی۔ آر۔ لاورس کی کتاب " افلاس اور ویلفیر اسٹیٹ" ملاحظہ ہو۔
[2] آر۔ ایچ ٹانیئے کی کتاب "مساوات"

امتیازوں کو کم کرنے میں بہت مفید ہو گی۔ بلکہ یہ امتیاز بہت بڑی حد تک ختم ہو جائینگے۔
آمدنی کی تقسیم میں تبدیلیوں اور جائداد کی معتدلانہ تقسیم جدید نے اسوقت تک عادات و
اطوار پر کچھ زیادہ اثر نہیں ڈالا ہے۔ برطانوی سماج ابھی تک ایک غیر مساوی سماج ہی ہے اور طبقاتی
حیثیت کا احساس اب بھی وہاں بہت قوی ہے لیکن یہ صورت حال اقتصادی حیثیت کی بڑھتی
ہوئی برابری کے مقابلے میں زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہ سکے گی۔ ایک طبقے سے دوسرے طبقے میں پہنچنے
کا جو سماجی عمل تیز سے تیز تر ہوتا ہے وہ اس پر ضرور اثر ڈالے گا۔ سماجی درجے کے نظام کی طرح
سماجی طبقے کا اصل جوہر بھی اس کا وراثتی کردار ہے جس حد تک یہ وراثتی کردار ختم ہوگا اس حد
تک طبقاتی نظام کی اہمیت بھی کم ہوتی جائیگی۔ خواہ آمدنی اور درجے کے اختلافات قائم بھی رہیں۔
یہ امر بدیہی ہے کہ بعد از جنگ کے برطانیہ میں سماجی طور پر اوپر اٹھنے کے امکانات میں جو
اضافہ ہوا ہے وہ بنیادی طور پر نظام تعلیم کی تبدیلیوں کا نتیجہ ہے جنگ سے پہلے ثانوی اور اعلیٰ تعلیم
تک رسائی حاصل کرنے کی مشکلات نے ایک سماجی طبقے سے دوسرے سماجی طبقے تک پہنچنے کو مشکل
بنا رکھا تھا۔ والدین کے اعلیٰ رتبے کا مطلب یہ تھا کہ ان کے بچّوں کو اعلیٰ تعلیم کی سہولتیں حاصل
ہیں جس کے نتیجے کے طور پر وہ اعلیٰ رتبے تک پہنچ جاتے تھے۔ اسی طرح والدین کے پست درجے کا
مطلب مجموعی طور پر یہ تھا کہ ان کے بچّے اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ درجے کی ملازمتوں سے محروم رہیں[۵۱]
حالیہ تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ اعلیٰ سکولوں کے طالب علموں کے سماجی درجے میں اب
کافی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اب مزدور طبقے کے خاندانوں کے بچّے ان سکولوں میں پہلے سے
کہیں زیادہ ہیں[۵۲]۔

---

۵۱ ایل۔ ہوگبین کی کتاب "سیاسی ریاضی" ملاحظہ ہو۔
۵۲ ڈی۔ وی۔ گلاس کی کتاب "برطانیہ میں سماجی ادل بدل" کے دیباچہ میں بتایا گیا ہے کہ
ایک علاقے ایس۔ ڈبلیو ہرٹ فورڈ شائر میں سنہ ۱۹۳۰ء اور سنہ ۱۹۵۱ء کے درمیان اعلیٰ سکولوں
کے مجموعی سالانہ داخلے میں سماجی کام کرنے والے مزدوروں کے بچّوں کا تناسب ۱۵ فیصدی سے
۴۳ فیصدی تک پہنچ گیا۔

سماجی حرکت پذیری میں جو اضافہ ہوا ہے وہ طبقاتی نظام میں براہ راست تبدیلی پیدا نہیں کرتا۔ اس کا عمل اس نظام کے اندر ہی جاری ہے لیکن اس کے دو بالواسطہ اثرات بہت اہم ہیں۔ یہ سماجی طبقوں کے وراثتی کردار پر ضرب لگاتا ہے اور ایسے لوگوں کو جن کے سماجی نسب میں بہت اختلاف ہوتا ہے ایک ہی سماجی سطح پر آپس میں ملا دیتا ہے۔ ان دونوں طریقوں سے یہ سماجی امتیازات میں اعتدال پیدا کرنے کا باعث ضرور بنتا ہے۔ اقتصادی نابرابری کو ختم کرنیوالی پالیسیوں کے ساتھ ایک ایسی زبردست قوت بھی کارفرما ہے جو سماجی مساوات کے فروغ کا باعث ہوگی۔

برطانوی سماج میں پیدا ہونے والی ان تبدیلیوں کو مختصراً ہم اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ اب مختلف سماجی طبقوں کے افراد کی اقتصادی حالت میں پہلے سے زیادہ برابری ہے۔ اس کا ثبوت معیار زندگی، صحت اور شرحِ اموات سے مل سکتا ہے۔ نچلے درجہ کے افراد کیلئے رسمی تعلیمی استعداد کے حصول کے بعد سماجی درجہ بندی میں اوپر اٹھنے کے مواقع اب پہلے سے زیادہ ہیں۔ اس کے ساتھ ہی سماجی درجہ بندی کی نوعیت بھی بدل گئی ہے۔ اب اس درجہ بندی میں کسی فرد کی حیثیت متعین کرنے کے لئے مہارت اور تربیت کو کہیں زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی ہے اور جائداد کی ملکیت کی اہمیت پہلے سے کہیں کم ہے۔

امریکہ

امریکہ ایک اہم معاملے میں باقی تمام یورپی سماجوں سے مختلف ہے۔ اس کا کوئی جاگیردارانہ ماضی نہیں۔ لہذا اس کے ابتدائی دور میں رتبوں پر مبنی ایسا کوئی نظام نہیں تھا جس کی بنیاد پر نئی سماجی درجہ بندی کی عمارت کھڑی کی جاسکتی۔ اس کا دور رس نتیجہ یہ ہوسکتا تھا کہ خالص دولت کی برتری اور اقتدار زیادہ یقینی ہو جاتے لیکن امریکی آزادی کے ابتدائی دور میں خود جائداد بھی وسیع تر پیمانے پر تقسیم شدہ تھی جیسا کہ ڈی ٹوکیو دائل نے سنہ ۱۸۳۰ء میں لکھا تھا: "بڑی بڑی دولت مندیاں ختم ہو رہی ہیں اور چھوٹی چھوٹی خوشحالیوں

کی تعداد بڑھ رہی ہے۔" اس دور میں کام کرنیوالے لوگوں میں اسی فیصدی لوگ ان وسائل پیداوار کے، جن سے وہ کام لیتے تھے، مالک تھے (نیگرو غلام اس تخمینے میں شامل نہیں) امریکہ بنیادی طور پر چھوٹے کسانوں، چھوٹے تاجروں اور چھوٹے پیشہ وروں کا ملک تھا۔ دولت کی نابرابریاں موجود ضرور تھیں لیکن وہ اتنی شدید نہیں تھیں جتنی یورپ میں اور نہ وہ رتبے کے اس اختلاف کو جنم دینے کا باعث بنیں جو ان یورپی سماجوں میں اب تک قائم ہیں جن میں جاگیرداری اور چندسری حکومت کے اثرات موجود ہیں۔

مساوی لوگوں کے سماج سے تعلق رکھنے کے جذبے کو اس امکان نے قوی تر بنا دیا کہ دولت مندی کی بالائی منزلوں تک پہنچا جا سکتا ہے۔ امریکہ ایک ایسا برِ اعظم تھا جو نہ ابھی پوری طرح دریافت ہوا تھا اور نہ اسے انسانی فائدے کیلئے پوری طرح استعمال ہی کیا گیا تھا۔ یہ مواقع کی دھرتی تھی جہاں جائداد بالخصوص زمین حاصل کرنا اور اپنی ذاتی کوششوں سے اس میں اضافہ کرنا ہمیشہ ممکن تھا۔

ڈیڑھ صدی کے عرصہ میں جو اقتصادی تبدیلیاں ہوئیں انھوں نے ان بیشتر بنیادوں کو تباہ کر دیا تھا جن پر نظریہ مساوات کی عمارت استوار تھی۔ چھوٹے جائداد مالکوں اور آزادانہ پیداوار کرنیوالوں کی اس سماج کی بنیادیں خانہ جنگی کے بعد کھوکھلی ہونی شروع ہوئیں۔ انیسویں صدی کے آٹھویں اور نویں عشرے میں جب "سرحدوں کو بند کیا گیا" تو اسی دور میں پہلی مرتبہ ٹرسٹ بھی عالم وجود میں آئے اور دولت کی نابرابریوں میں بھی بسرعت اضافہ ہوا۔ طبقاتی اختلافات واضح تر ہو گئے۔ یہ اختلاف یورپی سماجوں جیسے ہی تھے لیکن ان کا اظہار زیادہ برملا کیا جاتا تھا۔ اونچے طبقے کا شعوری وجود اس وقت قائم ہوا جب "سوشل رجسٹر" کی اشاعت ہوئی (امریکی اشرافیہ کے متعلق رہنمائی کرنیوالی کتاب) اور علیحدہ بورڈنگ سکولوں اور کلبوں کی بنیاد پڑی یا اس قسم کے دوسرے واقعات رونما ہوئے۔

اقتصادی ڈھانچے میں رونما ہونے والی ان تبدیلیوں کی نشاندہی پیشہ ورانہ اعداد و شمار سے واضح طور پر ہوتی ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں کام کرنیوالی آبادی کا اسّی فیصدی حصہ آزادانہ پیدا وار کرنے والوں پر مشتمل تھا۔ ۱۸۷۰ء میں اپنا کام آپ کرنے والوں کا تناسب صرف ۴۱ فیصدی تھا اور ۱۹۴۰ء میں صرف ۱۸ فیصدی۔ ایک امریکی ماہر عمرانیات کے لفظوں میں "گزشتہ ایک سو سال کے عرصہ میں امریکہ چھوٹے سرمایہ داروں کی قوم کی بجائے تنخواہ داروں کی قوم بن گئی۔ لیکن چھوٹے سرمایہ داروں کی قوم کے لئے جو نظریہ موزوں تھا وہ اب تک قائم ہے جیسے چھوٹی جائداد والوں کی دنیا اب تک بدستور چل رہی ہو۔[۱]"

بہرحال ملکیت کے اس ارتکاز کا نتیجہ یہ نہیں ہوا کہ محنت کش طبقے کی تعداد یا اس کی مصیبت میں اضافہ ہو گیا ہو۔ ۱۸۷۰ء میں صنعتی مزدوروں کے طبقے کا تناسب اجرت پر کام کرنے والی آبادی میں ۲۸ فیصدی تھا اور ۱۹۴۰ء میں ۳۱ فیصدی جبکہ اجرتی مزدوروں کی تعداد (جن میں کھیتوں پر کام کرنے والے مزدور اور ٹرانسپورٹ کے مزدور بھی شامل تھے) جو ۱۸۷۰ء میں ۵۳ فیصدی تھی ۱۹۴۰ء میں بھی صرف ۵۷ فیصدی ہی تھی لیکن اسی عرصے میں تنخواہ پر کام کرنیوالے ملازموں (نئے متوسط طبقے) کی تعداد میں بسرعت اضافہ ہوا۔ ۱۸۷۰ء میں آبادی میں ان کا تناسب صرف ۷ فیصدی تھا لیکن ۱۹۴۰ء میں یہ تناسب ۲۵ فیصدی تک پہنچ گیا۔ اندریں حالات نظریہ مساوات کے معدوم نہ ہونے کی ایک وجہ سفید پوش کارکنوں کی تعداد میں اضافہ تھا جن میں سے متعدد محنت کش طبقے سے اٹھ کر متوسط طبقے میں پہنچے تھے۔

غیر معمولی خوشحالیوں کا "دور زریں" جس کے پہلو بہ پہلو غیر معمولی افلاس ہوتا قائم نہیں رہا۔ دوسرے ملکوں کی طرح آمدنیوں پر بھاری ٹیکس اور جائدادوں پر بھاری ڈیوٹیاں جن کی شرح درجہ بدرجہ اونچی ہوتی جاتی تھی۔ جائیداد اور آمدنی کی از سر نو تقسیم کا

---

[۱] سی۔ رائٹ ملز کی کتاب "سفید پوش" یا امریکہ کے متوسط طبقے"

ذریعہ بنیں اور دو جنگوں سے پیدا ہونے والے ماحول نے اس تقسیم جدید کے عمل کو مزید تقویت پہنچائی۔ اس کے ساتھ ہی ٹریڈ یونینوں نے بھی نیچے درجے کی آمدنیوں کی سطح کو اونچا کیا۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں آبادی کا سب سے اونچا طبقہ جس کا تناسب صرف ایک فیصدی تھا مجموعی قومی آمدنی کا پندرہ فیصدی حصّہ وصول کر لیتا تھا۔ سنہ ۱۹۴۵ء میں اس طبقے کو صرف نو فیصدی حصّہ ملا۔ بدحالی کے دور کے علاوہ قومی آمدنی میں چونکہ مسلسل اضافہ ہوا ہے اس لئے مزدور طبقے کا معیار زندگی بھی کافی حد تک اونچا ہو گیا ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ برطانیہ کی طرح امریکہ میں بھی آمدنیوں میں برابری قائم ہو رہی ہے۔ معیار زندگی اونچا ہو رہا ہے اور متوسط طبقے کے ممبروں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ سماجی طبقاتی نظام کی بجائے خود زیادہ مخالفت نہیں کی گئی۔ امریکہ بے مثل اس معاملے میں ہے کہ وہاں طبقاتی احساس نسبتہً غائب ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر سماجی علیحدگی بہت کم ہے اور ان نابرابریوں کو بھی جو اقتصادی طور پر موجود ہیں غالباً بڑی آسانی کے ساتھ تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ امریکہ کے اس خصوصی وصف کی تشریح انیسویں صدی کی روایات کی روشنی میں کی جا سکتی ہے۔ اس صدی میں امریکہ میں سبھی کا ماحول قریب قریب ایک جیسا تھا اور مواقع بھی سب کے لئے یکساں تھے۔ یہ روایات بدلے ہوئے ماحول میں بھی برقرار رہی ہیں۔ جزواً صرف ایک تصوّر کی حیثیت سے اور جزواً اس لئے کہ وہ نئی قسم کی سماجی حرکت پذیری کے مطابق ہیں۔ حرکت پذیری کے اس عمل میں سماجی محنت کرنے والے مزدور کے لئے سفید پوش کارکن بننا یا کسی باوقار پیشے تک رسائی حاصل کرنا چنداں دشوار نہیں۔

بہرحال کچھ اور عناصر بھی ہیں جن کا مختصر ذکر ضروری ہے۔ سب سے زیادہ اہم چیز کثیر نیگرو آبادی کا وجود ہے۔ نیگرو آبادی کو اس اعتبار سے امریکہ کا پرولتاری طبقہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی آمدنیاں قلیل ترین ہیں۔ انھیں انتہائی گھٹیا کام کرنے پڑتے ہیں

اور امریکی سماج میں (میکسیکو اور پیوٹوریکا کے مہاجروں کے انتہائی قلیل گروپوں کے سوا) ان کا سماجی وقار سب سے کم ہے۔ سماجی درجہ بندی کی سب سے نچلی سیڑھی پر اس بڑے گروپ کی موجودگی کو جو کافی حد تک یکرنگ ہے، بہ آسانی قابلِ شناخت ہے اور دوسروں کے فائدے کے لئے استعمال ہو رہا ہے۔ امریکہ میں طبقاتی احساس رکھنے والی مزدور جماعت کے فقدان کی ایک وجہ کہا جا سکتا ہے۔ اس گروپ کے مقابلے میں ہر سفید امریکی خواہ وہ قلیل ترین تنخواہ لینے والا مزدور ہی کیوں نہ ہو کسی نہ کسی حد تک ایک سماجی وقار کا مالک ہے جو اسے پرولتاری طبقے کی سطح سے اونچا کر دیتا ہے لیکن امریکی نیگرو کی حیثیت میں اصلاح ہو رہی ہے اور اسکے نتیجے کے طور پر وہ بتدریج امریکی سماج کا ایک حصّہ بنتا جا رہا ہے۔ یہ اصلاح بالآخر نسلی امتیاز کو ختم کرنے کا باعث بن سکتی ہے اور اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہاں ایسے سماجی طبقے عالم وجود میں آجائیں جنکا باہمی فرق شدید طور پر نمایاں ہو۔

لیکن دو عناصر ایسے بھی ہیں جن کا عمل اس سے متضاد سمت میں ہے۔ پہلی بات یہ کہ زندگی کا اونچا معیار امریکی مزدور کو مارکسی نظریئے کے پرولتاری سے نمایاں طور پر مختلف بنا دیتا ہے۔ اس صورتِ حال میں صرف ایک اور انتہائی شدید اقتصادی بحران ہی فرق ڈال سکتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ امریکہ میں مزدور خاندانوں کے بچّوں کے لئے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع باقی تمام ملکوں کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔ اس کی بنیادی اہمیت تو یہ ہے کہ اس سے سماجی حرکت پذیری پر اثر پڑتا ہے لیکن یہ اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اس سے ثقافتی یکرنگی کے فروغ میں مدد ملتی ہے اور آداب اور طرزِ عمل کے اعتبار سے وہ ثانوی طبقاتی امتیازات کم ہوتے ہیں جن کا اثر بہت سے یورپی ملکوں میں بہت زیادہ ہے۔

یہ بات کافی حد تک یقینی ہے کہ سماجی عروج کے امکانات خواہ وہ حقیقی ہوں خواہ قیاسی، امریکہ میں طبقاتی نظام کو قبول کرنے کی بہت بڑی حد تک وضاحت کرتے

ہیں اور یہ بات یورپی انداز نظر کے متضاد ہے لہذا اس سوال کو کافی اہمیت حاصل ہے کہ امریکہ میں سماجی حرکت پذیری کی رفتار کتنی تیز ہے اور یہ کہ حرکت پذیری میں اضافہ ہو رہا ہے یا کمی۔ جو اعداد و شمار اس وقت مہیا ہیں ان کی بنا پر سرسری موازنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت امریکہ میں سماجی حرکت پذیری برطانیہ سے زیادہ نہیں[۱] مزید براں متعدد تحقیقاتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ تجارت کے رہنماؤں اور مختلف پیشوں کے ماہروں میں نئے ممبر انھیں خاندانوں سے لئے جا رہے ہیں جو خود ان تجارتوں اور پیشوں کو چلاتے ہیں[۲]۔ بہر حال ایک حالیہ مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ امریکہ ابھی تک اواقع کی دھرتی ہے۔ اگرچہ چند شعبوں میں سماجی حرکت پذیری محدود ہو گئی ہے تو اس کے لئے کچھ نئے راستے بھی پیدا ہو گئے ہیں[۳]۔

ہو سکتا ہے کہ حرکت پذیری کے جو امکانات ایک وسعت پذیر اقتصادی نظام اس وقت تک پیش کر رہا ہے انھیں کسی آئندہ مرحلے پر طے شدہ سماجی پالیسی کے ذریعہ پیدا کرنا پڑے۔ مساوی مواقع کی روایت ہی اس پالیسی کی زبردست معاون ثابت ہوگی۔ صدر روز ویلٹ نے نیوڈیل کے نام پر جس پالیسی کا اجرا کیا وہ خود اس بات کی شاہد ہے کہ امریکی سماج میں جو قوتیں مساوات کو فروغ دینا اور دولت کے اقتدار کو محدود کرنا چاہتی ہیں وہ بہت قوی ہیں۔

---

[۱] ڈی۔ وی۔ گلاس کی کتاب "برطانیہ میں سماجی حرکت پذیری" کا آٹھواں باب۔

[۲] مثال کے طور پر آر سنٹرس کی کتاب "سماجی طبقوں کی نفسیات" ملاحظہ ہو۔ مصنف نے باپوں اور بیٹوں کے پیشوں کا موازنہ کر کے بتایا ہے کہ تجارت، ماہرانہ پیشوں اور سفید پوشانہ ملازمتوں میں مصروف باپوں کے ۷۱ فیصدی بیٹے بھی انھیں تجارتوں، پیشوں اور ملازمتوں میں گئے ہیں۔ اسی طرح جسمانی مشقت کے پیشے اختیار کرنیوالے باپوں کے ۷۰ فیصدی بیٹے بھی جسمانی مشقت کے پیشوں میں ہی گئے۔ اس سلسلے میں سی۔ رائٹ ملز کا مضمون "امریکہ کا کاروباری اشرافیہ — ایک اجتماعی تصویر" بھی کافی اہم ہے۔

[۳] سی۔ مو۔ ایم۔ بیٹ اور رینہارڈ بینڈکس کا مطالعہ "امریکہ میں نظریاتی مساوات اور سماجی حرکت پذیری" جو عمرانیات کی دوسری عالمی کانگرس میں پیش کیا گیا۔

سوویٹ یونین[1]:-

مارکس کا عقیدہ تھا کہ سرمایہ داری "عمل پیداوار کا آخری نظام ہے جو مخالفت کے اصول پر" قائم ہے۔ اس نے اپنی کتاب "فلسفے کا افلاس" میں لکھا تھا: "محنت کش طبقے کی نجات کی شرط یہ ہے کہ تمام طبقوں کو ختم کر دیا جائے..... مزدور طبقہ اپنے ارتقا کے دوران پرانے سماج کے بجائے ایک ایسی ایسوسی ایشن کو عالم وجود میں لے آئے گا جس میں، نہ طبقے ہوں گے اور نہ ان طبقوں کی باہمی مخالفت..... "

سوویٹ یونین کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک ایسا سماج ہے جسے مارکس کی پیش گوئی کے مطابق سرمایہ داری کے خاتمے کے بعد قائم ہونا تھا۔ سوویٹ یونین مدعی ہے کہ وہ ایک غیر طبقاتی سماج ہے۔ یا صحیح تر لفظوں میں وہ ایک ایسا سماج ہے جس میں طبقات کی بنا پر سماجی اونچ نیچ نہیں اور جس میں بالآخر طبقے معدوم ہو جائیں گے۔ بالفعل اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وسائل پیداوار میں ذاتی ملکیت کو ختم کر دیا گیا ہے۔ یہ امر مشکوک ہے کہ مارکس صرف اسی قدر چاہتا تھا لیکن مستقبل کے سماج کا جو نقشہ اس نے پیش کیا ہے وہ مبہم بھی تھا اور بے جوڑ بھی۔ اور اس نے مساوات کے تصورات کی بھی مذمت کی ہے اگرچہ بظاہر اس نے ایسا اس لئے کیا ہے کہ مساوات کے اس دور کے حامی اس نظام

---

[1] سوویٹ یونین میں سماجی درجہ بندی کی تشکیل کے متعلق مطبوعہ مواد نسبتہً برائے نام ہے ایسے کوئی سماجی جائزے موجود نہیں جو اس معاملے میں براہ راست معلومات فراہم کرتے ہیں۔ جن ماخذ سے اس مطالعے میں فائدہ اٹھایا گیا ہے ان میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں۔ جون۔ این۔ ہیزرڈ کا مقالہ "سوویٹ یونین میں جائداد کا قانون اور سماجی تبدیلی"۔ انھیں صاحب کا مقالہ "سوویٹ یونین میں قانون اور سماجی تبدیلی"۔ ایلیس اینکلیس کا مقالہ "سوویٹ یونین میں سماجی مدارج اور حرکت پذیری" جو امریکن "سوشیالوجیکل ریویو" کے اگست ۱۹۵۰ء کے شمارے میں شایع ہوا۔ روڈولف شلیسنگر کی کتاب "بعد از جنگ کے روس کی روح"۔ ایس۔ ایم سیجوارڈ کی کتاب "سوویٹ یونین کے مزدور"۔

جائداد کو نظر انداز کر رہے تھے جو عدم مساوات کی بنیاد تھا۔

خواہ کسی بھی پہلو سے غور کیا جائے سوویٹ یونین مساوات کا سماج نہیں ہے۔ موجودہ صدی کے تیسرے عشرے کی ابتدا سے ہی سوویٹ حکمرانوں کی یہ سرکاری پالیسی رہی ہے کہ تنخواہوں کے فرق میں اضافہ کیا جائے اور یہ کہ ماہر مزدوروں، کاریگروں، صنعتی اداروں کے مینیجروں اور دانشوروں کو خاص طور پر بھاری مالی معاوضوں کا لالچ دیا جائے۔ سوویٹ رہنماؤں نے نظریۂ مساوات کو "نیم بورژوائی انحراف" کہہ کر بارہا اس کی مذمت کی ہے اور سوویٹ انسائیکلوپیڈیا نے دو ٹوک اعلان کیا ہے کہ "سوشلزم اور نظریۂ مساوات میں کوئی قدر مشترک نہیں"[1]۔ جنگ اور بعد از جنگ کے زمانوں میں ان مساوات دشمن رجحانات نے مزید زور پکڑا۔ اب سوویٹ یونین میں آمدنیوں کا فرق بہ نسبت مغربی ملک کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ صنعت میں ناتربیت یافتہ مزدوروں کی سالانہ تنخواہیں ۱۹۵۳ء میں ۲۵۰۰ روبل سے ۵۰۰۰ روبل تک تھیں اور فیکٹری کے ایک اہم مینیجر کو ۸۰۰۰۰ سے ۱۲۰۰۰۰ روبل سالانہ تک تنخواہ ملتی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بلند ترین سطح کی آمدنیاں پست ترین سطح کے مقابلے میں ۲۵ گنا سے ۳۰ گنا تک تھیں۔ بادی النظر میں یہ سطح وہی ہے جو برطانیہ یا امریکہ میں ہے۔ ان دونوں ملکوں میں بھی ایک ناتربیت یافتہ مزدور اور ایک بڑی صنعتی کمپنی کے مینیجنگ ڈائرکٹر کی آمدنی میں قریب قریب اتنا ہی فرق ہے لیکن ٹیکسوں کی ادائیگی کے بعد سوویٹ یونین میں آمدنیوں کے فرق کی سطح کہیں زیادہ اونچی ہو جاتی ہے۔ سوویٹ یونین میں انکم ٹیکس صرف ۱۲ ہزار روبل فی سال آمدنی کی سطح تک ہی تدریجی ہوتا ہے۔ اس سطح کے بعد انکم

---

[1] اس اعلان کا ایک برطانوی سوشلسٹ کے نظریئے کے ساتھ موازنہ خالی از دلچسپی نہیں ہوگا جو یہ کہتا ہے کہ "جہاں مساوات نہیں وہاں سوشلزم نہیں"۔ رائے جینکنز کا مضمون "مساوات" جو ۱۹۵۲ء میں "نیو فیبین ایسیز" نامی کتاب میں شائع ہوا۔

ٹیکس کی شرح سپاٹ ہو جاتی ہے جو ۱۳ فیصدی ہے۔ مجموعی طور پر سوویٹ یونین میں ٹیکسوں کا نظام ترقی پسندانہ نہیں بلکہ رجعت پسندانہ ہے کیونکہ بجٹ کی آمدنی کا بہت بڑا حصّہ (۶۰ فیصدی) بکری ٹیکس سے وصول کیا جاتا ہے جو بنیادی طور پہ اناج اور کپڑے پر عائد ہے۔ ظاہر ہے کہ امیر خاندانوں کے مقابلے میں غریب خاندان ان دو چیزوں پر اپنی مجموعی آمدنی کا نسبتہً زیادہ حصّہ صرف کرتے ہیں۔

اقتصادی نابرابریوں کی دوسرے طریقوں سے بھی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے ان میں اہم ترین اقدام وہ تھا جب سنہ ۱۹۴۲ء میں وراثتی ٹیکس کو ختم کر دیا گیا۔ یہ ٹیکس سنہ ۱۹۲۶ء سے عائد تھا اور اس کی شرح بتدریج بلند ہوتی جاتی تھی۔ بڑی بڑی جاگیروں کے لئے اس ٹیکس کی شرح ۹۰ فیصدی تک پہنچ گئی تھی۔ نئے قانون کے مطابق اس ٹیکس کی بجائے رجسٹریشن فیس عائد کر دی گئی ہے جو جائداد کی مجموعی قیمت پر دس فیصدی سے زیادہ نہیں ہوتی۔

ان اقدامات کے نتائج کے متعلق کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ یہ کارروائیاں سوویٹ سماج کے اعلیٰ طبقوں کے افراد کو اس قابل بنا دیتی ہیں کہ وہ اپنی اونچی آمدنیوں سے پورا پورا فائدہ اُٹھائیں اور ان فائدوں کو اپنی اولاد تک بھی منتقل کر دیں۔ سٹالن انعامات اونچے طبقوں کی پوزیشن کو اور بھی بہتر بنا دیتے ہیں کیونکہ یہ انعامات سماجی درجہ بندی کی نچلی سطحوں تک کبھی نہیں پہنچتے اور اس نئے رواج نے تو ان طبقوں کی حالت کو اور بھی بہتر بنا دیا ہے جس کی رو سے ممتاز سوویٹ شہریوں کی بیواؤں اور وارثوں کو وافر گرانٹیں اور سالانہ وظائف دیئے جاتے ہیں۔

بہرحال یہ دلیل بسا اوقات پیش کی جاتی ہے کہ دولت آمدنی اور معیار زندگی کی یہ نابرابریاں جو مصدقہ طور پر بہت زیادہ ہیں، ایک نئے سماجی طبقات کے نظام کے مترادف نہیں ہیں۔ چنانچہ مائیکل گورڈن نے اپنے سوویٹ یونین کے حالیہ دورے کی

معلومات افروز لیکن بسا اوقات گمراہ کن رپورٹ[1] میں رقمطراز ہے: "تنخواہوں کے اس گہرے اختلاف کی بنا پر بعض لوگ یہ نتیجہ اخذ کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں کہ سوویٹ سماج نے طبقات کو واقعتہً ختم نہیں کیا..... مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ مغربی ملکوں میں طبقے جس طرح موجود ہیں ان کا سوویٹ یونین میں حقیقی معنی واقعی موجود نہیں ہے۔ دولت مندی کی بنیاد پر تعصبات، کڑی حد بندیاں اور کسی طبقے کی نیچے کی طرف سے اپنی صفوں میں توسیع کی منظم مخالفت، یہ ایسی چیزیں ہیں جو یا تو سوویٹ یونین میں معدوم ہیں یا ان کے ہمیشہ کے لئے معدوم ہو جانے کا عمل جاری ہے۔ تعلیم کا وسیع پھیلاؤ اور حکّام کی طرف سے ان عناصر کی جن کی حیثیت کچھ زیادہ اچھی نہیں سماجی ترقی کے لئے حوصلہ افزائی یہ تمام باتیں اس آخری نتیجے کی نشاندہی کر رہی ہیں جسے بجا طور پر ایک غیر طبقاتی سماج کہا جا سکتا ہے..... یہی وجہ ہے کہ سوویٹ یونین میں طبقات کی موجودگی یا عدم موجودگی کی بات کرتے وقت آدمی کو یہ بات ہر صورت میں تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ نچلے طبقے کے ممبروں کے لئے اعلیٰ طبقوں میں شمولیت کے دروازے کافی کشادہ طور پر کھلے ہیں اور مراعات یافتہ سطحوں میں ارتکاز اور کڑی حد بندیاں موجود نہیں اور ان کا وراثتی پہلو تو خاص طور پر ناپید ہے۔"

یہ بات ثابت کرنے کے لئے کہ سوویٹ یونین میں کڑی حد بندیاں رکھنے والے سماجی طبقے اب موجود نہیں رہے۔ سماجی حرکت پذیری کی فراوانی اور اس حرکت پذیری میں رکاوٹوں کے فقدان کا ذکر بسا اوقات کیا جاتا ہے لیکن اس قسم کی دلیلوں میں نہ تو سماجی حرکت پذیری کی فراوانی کے اسباب کو مدّنظر رکھا جاتا ہے اور نہ ان حالیہ تبدیلیوں کو جو اس حرکت پذیری کو کم کرنے کا رجحان رکھتی ہیں۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں امریکہ کی طرح سوویٹ یونین میں بھی برق رفتاری

---

[1] مائیکل گورڈے "ماسکو کا سفر"

کے ساتھ صنعتی ترقی ہوئی۔ اس برق رفتار ترقی نے ۱۹۲۰ء کے بعد سماجی مدارج کی بالائی سطحوں میں وسیع پیمانے پر نئی گنجائشیں پیدا کر دیں اور اس طرح سائنسدانوں کاریگروں صنعتی اداروں کے منیجروں، استادوں اور دانشوروں کی مانگ میں بہت اضافہ ہو گیا۔ ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۷ء تک کے درمیانی عرصے میں ملازمت پیشہ آبادی کی تعداد جہاں صرف دگنی ہوئی۔ وہاں دانشوروں کی تعداد تقریباً چار گنا ہو گئی ـــــ دانشوروں سے مراد افسر، پیشہ ورانہ مہارت رکھنے والے مزدور، منیجر اور کلرک ہیں۔ بعض پیشوں میں تو اضافہ اور بھی زیادہ ہوا۔ انجینیروں اور ماہرین فن تعمیر کی مجموعی تعداد آٹھ گنا ہو گئی اور سائنسی شعبوں میں کام کرنیوالوں کی تعداد تقریباً چھ گنا۔

لیکن جونہی اقتصادی ڈھانچہ کی یہ تبدیلیاں اور نتیجہ کے طور پر پیشہ ورانہ نظام کی تبدیلیاں اپنی حد تکمیل کو پہنچ جائیں گی۔ سماجی حرکت پذیری کی رفتار مدھم پڑ جائے گی بشرطیکہ ارادۃً کسی ایسی پالیسی کو نہ اختیار کیا گیا جس کا مقصد موجودہ رفتار کو برقرار رکھنا ہو۔ لہٰذا حرکت پذیری کی رفتار میں جو اضافہ ہوا اسے ایک ایسا حادثہ سمجھنا چاہیئے جو صنعتی ترقی کی ضرورتوں کا تقاضا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیئے کہ حرکت پذیری کی رفتار کو تیز کرنے کی کوئی شعوری کوشش کی گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسی شہادتیں موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ سماجی حرکت پذیری کو اب محدود کیا جا رہا ہے اس سلسلے میں ایک قدم ۱۹۴۰ء میں اٹھایا گیا۔ جب اعلیٰ تعلیم اور ثانوی تعلیم کے آخری تین برسوں میں فیس از سر نو لگا دی گئی۔ اگرچہ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں داخلہ اب بھی مقابلے کے امتحانوں سے ہوتا ہے اور گزارے کے لئے گرانٹیں بھی دی جاتی ہیں لیکن یہ بات خارج از امکان نہیں کہ فیس کے اجرا سے اعلیٰ تعلیم کے لئے اونچے طبقوں کے نوجوانوں کے لئے ماحول زیادہ سازگار ہو گیا ہو۔ یہ بات غالباً اہم ہے کہ

۱۹۳۵ء کے بعد اس قسم کے اعداد و شمار شائع نہیں کئے گئے جن سے پتہ چل سکتا ہو کہ سوویٹ یونین کے طلبا کی آبادی میں سماجی تناسب کیا ہے؟

قوانین وراثت میں جن تبدیلیوں کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے وہ بھی سماجی حرکت پذیری کو محدود کرنے والی ہیں۔ جہاں وراثت میں کافی دولت مل سکتی ہو، وہاں بچّوں کے لئے اس سماجی سطح سے نیچے گرنا جن تک ان کے والدین نے رسائی حاصل کر لی ہو نسبتہً زیادہ مشکل ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ دوسرے بچوں کے لئے اوپر اٹھنے کے امکانات نسبتہً کم ہیں۔ اس قسم کی شہادتیں اب بھی موجود ہیں کہ سوویٹ یونین میں سماجی درجہ براہ راست وراثت میں ملتا ہے اور سماج میں اہم عہدوں تک رسائی کا انحصار پیدائش کے اتفاقی حادثے پر ہی ہے۔ جیسا کہ انیکلیس[۱] نے اشارہ کیا ہے۔ ان رجحانات کو اس مہم سے مزید تقویت ملتی ہے جس کا مقصد سوویٹ یونین میں خاندان کو بحال کرنا ہے۔ خاندانی مراسم جتنے قوی ہوں گے اتنی ہی یہ خواہش بھی قوی ہوتی جائے گی کہ باپ اپنے بچوں کی مراعاتی حیثیت کو برقرار رکھنے کا انتظام کرے۔

لہٰذا ایم۔ گورڈے جس قسم کی دلیلیں پیش کرتا ہے وہ بظاہر سوویٹ سماج کے ایک ایسے ماحول سے تعلق رکھتی ہیں جو بڑی تیزی کے ساتھ ختم ہو رہا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ سوویٹ نظام مدارج کی بالائی سطحوں کے دروازے اب تک کھلے ہوں اور نچلے سماجی طبقے کے افراد ان تک بہ آسانی رسائی حاصل کر سکتے ہوں۔ لیکن ایسا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ بحالات موجودہ وہاں سماجی حرکت پذیری کی رفتار مغربی جمہوریتوں سے زیادہ ہے اور ایسے متعدد ثبوت موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس رفتار کو عمداً کم کیا جا رہا ہے۔ سوویٹ حکومت کا جواز پیش کرنے والوں

---

[۱] الیکس انیکلیس کا مقالہ "سوویٹ یونین میں سماجی مدارج اور حرکت پذیری" جو امریکی "سوشیالوجیکل ریویو" کے اگست سنہ ۱۹۵۰ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

کی طرف۔ سے اکثر یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ وہاں آمدنی کی غیر معمولی نابرابریوں کے باوجود عام میل جول میں کوئی بہت بڑی نابرابری موجود نہیں لیکن یہ اگر سچ بھی ہو تو بھی اسے کوئی بے مثل کارنامہ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ جیسا کہ میں اوپر ظاہر کر چکا ہوں۔ یہ امریکی سماج کا ایک دیرینہ وصف ہے اور دوسرے جمہوری ملکوں میں بھی یہ زیادہ سے زیادہ حقیقت بنتا جا رہا ہے۔

سماجی میل جول کے نقطۂ نگاہ سے زیادہ اہم چیز غالباً یہ ہے کہ سوویٹ یونین میں اس وقت تک "آرام طلب طبقے" کا وجود نہیں۔ یہ بات کہ سماجی درجے کا انحصار بنیادی طور پر پیشے پر ہے۔ سماجی برابری کے فروغ کے لئے غالباً مفید ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ سماجی درجے کا انحصار اس بات پر ہے کہ مشترکہ مفادمیں کوئی کس حد تک واضح حصہ ادا کرتا ہے (خواہ مختلف حصوں کی نسبتی قدر و قیمت کا فیصلہ کتنے ہی خود سرانہ انداز میں کیوں نہ کیا جائے)۔ جمہوری ملکوں کے تجربوں سے یہ بات کافی حد تک واضح ہو جاتی ہے کہ جن طبقاتی امتیازات کی بنیاد جائداد کی ملکیت پر ہوتی ہے وہ ان امتیازوں کے مقابلے میں جن کی بنیاد کمائی ہوئی آمدنیوں پر ہو۔ زیادہ شدت سے محسوس کئے جاتے ہیں۔ اور ان کے اثرات وراثتی بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ اس بات کو پیش نظر رکھنا بھی اہم ہے کہ سوویٹ یونین میں دانشوروں کی طرح جسمانی محنت کرنیوالے کاریگروں کو بھی بسا اوقات اونچی تنخواہ دی جاتی ہے اور مغربی ملکوں کے مقابلے میں وہاں جسمانی محنت کرنیوالے اور غیر جسمانی محنت کرنیوالے مزدوروں کے درمیان ثقافتی اور سماجی حدبندیاں کم شدید[1] ہیں۔

---

[1] جمہوری ملکوں میں جسمانی کام کرنے والے مزدوروں کی مسلسل سماجی علیحدگی عمرانی تحقیقات سے پوری طرح ثابت ہو چکی ہے۔ فرانس میں یہ تحقیقات پی۔ ایچ۔ چومبارٹ ڈیلوولے نے کی ہے؛ برطانیہ میں ٹی۔ بی۔ بوٹومور کی کتاب "رضاکارانہ تنظیموں میں سماجی مدارج کی تشکیل" (بقیہ صفحہ ۴۳ پر ملاحظہ ہو)

لیکن سوویٹ یونین میں سماجی مدارج کا یہ صرف ایک پہلو ہے۔ درمیانی درجوں کے افراد کے درمیان سماجی مراسم خواہ کسی بھی قسم کے ہوں لیکن اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ سوویٹ اشرافیہ کے ممبروں میں سماجی علیحدہ پسندی پائی جاتی ہے۔ پارٹی کے افسرانِ اعلیٰ، ممتاز دانشوروں، صنعتی علوم کے ماہروں اور بیورو کریٹوں کو ایک طبقۂ اشرافیہ کا درجہ بھی حاصل ہے اور وہ تمام مادی فائدے بھی جو انھیں باقی آبادی سے ممتاز کریں مثلاً موٹر گاڑیاں، ذاتی شاندار کوٹھیاں، خدام مسلح محافظ، ذاتی معالج، اور ان کے بچوں کی تعلیم کے لئے خصوصی مراعات۔ وہ جمہوری سماج کے طبقۂ اشرافیہ کے مقابلے میں ایک عام شہری سے کہیں زیادہ دور ہیں اور اس کے سامنے کہیں کم جوابدہ۔

نئی تبدیلیوں کا رخ بھی موجودہ نابرابریوں سے کسی طرح کم اہم نہیں سوویٹ حکومت کا جواز پیش کرنیوالے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ موجودہ رجحانوں کا رُخ تبدیل بھی کیا جاسکتا ہے اور کمیونسٹ سماج کے کسی آئندہ مرحلے میں موجودہ اقتصادی نابرابریاں ختم ہو جائیں گی اور اس اعلیٰ مرحلے میں ان کی جگہ یہ اصول لے لیگا کہ "ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق ملے"۔ تاریخ ایسا کوئی ثبوت پیش نہیں کرتی کہ مراعات یافتہ گروپ ان گروپوں کے دباؤ کے بغیر جو مروجہ سماجی نظام میں تکلیفیں اٹھاتے ہوں، اپنی مراعات سے دستبردار ہو گئے ہوں۔ لیکن سوویٹ یونین کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہاں اس قسم کی کشمکش موجود

(بقیہ صفحہ ۴۲ سے آگے) اور ڈی۔ وی گلاس کی کتاب "برطانیہ میں سماجی حرکت پذیری" میں اس کے اچھے مطالعے کئے گئے ہیں۔ امریکہ میں اس سلسلہ میں متعدد مطالعے کئے گئے ہیں۔ غالباً یہ علیحدگی سماجی حرکت پذیری میں اضافے اور معیار زندگی کے اونچا ہونے کی وجہ سے بتدریج ٹوٹتی جا رہی ہے۔ لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ امتیاز قائم کرنیوالی حدیں اب بھی کافی نمایاں ہیں۔

نہیں۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کا وجود سوویٹ نظام کے حامی ہرگز تسلیم نہیں کریں گے۔
سوویٹ یونین کے حامیوں کا استدلال اس امر کو بھی نظرانداز کر دیتا ہے کہ نئے
سلسلۂ مدارج کو رسمی سماجی رتبوں اور نشاناتِ امتیازی کے احیا سے بھی کافی تقویت
پہنچتی ہے۔ یہ رتبے اور نشانات امتیازی صرف فوج ہی میں بحال نہیں کئے گئے
جہاں مخصوص عہدوں کے لئے مخصوص تمغے دیئے جاتے ہیں بلکہ شہری ایڈمنسٹریشن
میں بھی ان کا رواج از سرِ نو شروع ہو گیا ہے۔

کمیونسٹ مصنفوں کا بنیادی دعویٰ بہرحال یہ ہے کہ سوویٹ سلسلۂ
مدارج میں اعلیٰ منصب دار ایک نئی حکمراں جماعت نہیں بن سکیں گے کیونکہ
وہ وسائلِ پیداوار کی ملکیت حاصل نہیں کر سکیں گے۔ جیسا کہ ایک نقاد[1] نے
حال ہی میں کہا ہے کہ سوویٹ لیڈر "اپنے عقیدے کے اس بنیادی
اصول کی پوری احتیاط کے ساتھ پابندی کر رہے ہیں کہ جائداد کی ملکیت سیاسی
اقتدار کی کنجی ہے۔" اس کی بجائے ہم مغربی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مقتدرانہ حیثیت
قائم کرنے میں صرف انہی مراسم کو دخل نہیں ہوتا جو جائداد کے گرد گھومتے ہیں
بلکہ ایسی بھی کئی سماجی حیثیتیں ہیں جو کسی سماجی گروہ کو مقتدر بنانے کا باعث بن
سکتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سوویٹ رہنما بھی اس امرِ واقعی کو تسلیم کرنے
لگے ہیں جیسا کہ ٹریڈ یونینوں، کوآپریٹو اداروں اور دوسرے موثر گروہوں کو
کنٹرول کرنے کی کوششوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ ضابطۂ آئین سے البتہ یہی ثابت
ہوتا ہے کہ وہ مدارج اقتدار کے سلسلے میں سب سے اونچی جگہ ابھی تک

---

[1] جان۔ این ہیزرڈ کا مقالہ "سوویٹ ضابطۂ جائداد اور سماجی تبدیلی" جو برٹش جرنل آف سوشیالوجی کے مارچ ۱۹۵۳ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

روائتی عنصر کو دے رہے ہیں۔ یہ روائتی عنصر وسائل پیدا وار کی نجی ملکیت ہے خدام و فادار کو ہر قسم کے انعامات سے نوازا جاتا ہے مثلاً دولت، اعلیٰ سماجی حیثیت، تمغے اور مراعات خصوصی۔ لیکن انھیں یہ موقع مہیا نہیں کیا جاتا کہ وہ جاگیرداروں اور کارخانہ داروں کی ایک نئی نسل بن جائیں۔

میرا خیال ہے کہ مارکس کا نظریۂ سیاست ناقص ہے جیسا کہ ہیز رڈ نے کہا ہے وسائل پیدا وار کی ملکیت سیاسی اقتدار کی ایک بنیاد ضرور ہے لیکن یہ واحد بنیاد ہرگز نہیں۔ سیاسی اشرافیہ کے مفہوم میں مراعات یافتہ طبقوں کی تشکیل مختلف طریقوں سے ہو سکتی ہے۔ ایک بیرونی مبصر غالباً یہی نتیجہ اخذ کرے گا کہ سوویٹ یونین میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے نئے حکمران طبقے کی تشکیل کے سوا اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ اس طبقے کی مراعات کا استحکام بھی ہو رہا ہے اور باقی سماج پر اس کا اقتدار بھی مستحکم ہو رہا ہے۔

اگر نئے حکمران طبقے کی نوعیت پر ذرا گہری نظر ڈال لی جائے تو یہ مفید ہوگا۔ جیسا کہ ہیز رڈ نے اشارہ کیا ہے سوویٹ یونین میں دوسرے ملکوں ہی کی طرح متعدد موثر گروپ ہیں جو اشرافیہ بننے کی اہلیت رکھتے ہیں سوویٹ یونین کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کے اقتدار کے توسل سے یہ تمام منتخب گروہ آپس میں مل جاتے ہیں۔ مدارج کے دو انتہائی اہم سلسلوں کے باہمی رابطے سے یہ حقیقت اچھی طرح نمایاں ہو جاتی ہے۔ ان میں ایک سلسلۂ مدارج خود کمیونسٹ پارٹی ہے اور دوسرا مینیجروں اور صنعتی ماہروں کا گروہ۔ مدارج کی اعلےٰ سطحوں پر یہ دونوں سلسلے آپس میں مل جاتے ہیں اور صنعت اور انتظام ملک کے

کلیدی عہدے ایسے لوگوں کے پاس شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں جو پارٹی کے ممبر نہ ہوں۔ کمیونسٹ پارٹی اور اشرافیہ کے دوسرے گروہوں مثلاً فوجی رہنماؤں اور دانشوروں کے روابط بھی اسی قسم کے ہیں۔ طبقات اشرافیہ کی یہ وحدت، تمام کمیونسٹ سماجوں کا امتیازی پہلو ہے اور اس، امر کی ضمانت ہے کہ اقتدار اور رسوخ کے تمام عہدوں پر کمیونسٹ پارٹی کا ہی کنٹرول ہوگا۔ خواہ یہ عہدے اقتصادی ہوں خواہ فوجی یا سیاسی۔ مختار دانشوروں کا بھی پارٹی سے تعلق رکھنا ضروری ہے۔[1]

جمہوری ملکوں اور سوویٹ یونین کا موازنہ دو مختلف نقطہ ہائے نظر سے کیا جا سکتا ہے۔ ایک یہ ہے کہ موجودہ صورت حال کیا ہے اور دوسرے یہ کہ تبدیلی کی سمت کیا ہے۔ موجودہ صورت میں ان دونوں سماجی نظاموں میں آمدنیوں کی نابرابریوں کی سطح بادی النظر میں ایک ہی ہے۔ لیکن جب ٹیکسوں کے اثرات بھی پیش نظر رکھے جائیں تو سوویٹ یونین میں نابرابریوں کی سطح کافی اونچی ہو جاتی ہے۔ ان سماجوں میں سلسلۂ مدارج کی نوعیت بھی قریب قریب ایک جیسی ہے۔ مدارج کے ان دونوں سلسلوں میں حیثیت کا تعین پیشہ کرتا ہے حیثیت کا فیصلہ جائداد کی ملکیت نہیں بلکہ یہ امر کرتا ہے کہ کوئی کس قسم کا کام کرتا ہے۔ مینیجری کے عہدے اقتدار اور وقار کی زیادہ سے زیادہ بنیاد بنتے جا رہے ہیں۔ سوویٹ یونین میں یہ چیز بہت نمایاں ہے لیکن یہی

---

[1] ریمنڈ ایرون نے اپنے دو مقالوں میں کمیونسٹ اور جمہوری ملکوں کے اشرافیہ کا ایک دلچسپ تجزیہ پیش کیا ہے۔ یہ مقالے "سماجی نظام اور حکمراں طبقے" کے عنوان سے برٹش جرنل آف سوشیالوجی کے مارچ ۱۹۵۰ء اور جون ۱۹۵۰ء کے شماروں میں شائع ہوئے۔

صورت حال جمہوری ملکوں میں بھی ہے۔ جمہوری ملکوں میں صورت حال مختلف اس طرح ہے کہ ایک گروپ کی طاقت کو محدود کرنے کے لئے دوسرے آزاد گروپ موجود ہیں۔ مثلاً سیاسی پارٹیاں، کارخانہ دار، ٹریڈ یونینیں اور مختلف قسم کے دوسرے موثر گروپ۔ یہ فرق بہت زیادہ اہم ہے کیونکہ ایک واحد اور یکہ تنگ طبقۂ اشرافیہ کے عالم وجود میں آنے کا مطلب آزادی اور مساوات کی موت ہے۔

جب ہم رونما ہونے والی تبدیلیوں کی سمت پر نظر ڈالتے ہیں تو دونوں نظاموں کا فرق بہت زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔ سوویٹ یونین میں اقتصادی نابرابری بڑھ رہی ہے اور اعلیٰ سماجی طبقوں کی قوت اور ان کی مراعات میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ جمہوری ملکوں میں اقتصادی نابرابریوں کو مسلسل کم کیا جا رہا ہے اور جو گروپ سماجی سلسلۂ مدارج کی چوٹی پر ہیں ان کے اقتدار کو محدود کرنے اور اس پر پابندیاں لگانے کی متواتر کوشش ہو رہی ہے اس بات پر بحث میں آئندہ باب میں کروں گا کہ ان کوششوں کا سلسلہ کہاں تک پہنچے گا اور کہاں تک ان پر زور دیا جانا چاہیئے۔ موجودہ باب کو ختم کرنے سے پہلے یہ بات دلچسپ ہوگی کہ ان دونوں مختلف قسم کے سماجوں میں دو انتہائی مختلف قسم کی جو تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں ان پر ان سماجوں کے الگ الگ سماجی فلسفوں کی روشنی میں غور کر لیا جائے۔

مغرب کے جمہوری ملکوں میں مختلف قسم کے سماجی فلسفوں نے مارکس کی تعلیمات کا اثر قبول کیا ہے۔ مختلف مدرسہ ہائے فکر سے تعلق رکھنے والے سماجی مصلحین نے سماجی مساوات کے آدرش کی قابل فہم حد تک تکمیل کی عملی کوششیں کی ہیں۔ اسی طرح مشترکہ شہریت کے آدرش کی تکمیل کے لئے بھی کوششیں ہوئی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مارکس نے "سماجی مسئلے" کو پرجوش انداز میں پیش کرکے اور اپنے سماجی تجزیے سے ان آدرشوں کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ مغرب کے جمہوری ملکوں میں برابری اور نابرابری اپنے اصلی رنگوں میں موجود ہیں اور لوگ برملا ایک دوسرے کی حمائت یا مخالفت کرتے ہیں، سوویٹ یونین میں صرف ایک ادعائی نظرئے کی حکمرانی ہے اور اس عقیدے کی بنیاد " ذومعنی گفتگو" ہے جس کے ذریعہ مسائل کو الجھانے کی باقاعدہ کوشش کی جاتی ہے۔ مساوات کی مذمت کی جاتی ہے کہ مبادا یہ حکمراں طبقے کی مراعات کو خطرے میں ڈال دے لیکن اس کے ساتھ ہی "غیر طبقاتی سماج" کی اخلاقی برتری کا دعویٰ کرکے مساوات کے جذبے سے ناجائز فائدہ بھی اٹھایا جاتا ہے اور مراعات کی پردہ پوشی اس طرح کی جاتی ہے کہ یہ مراعات نہیں بلکہ کریم النفسی پر مبنی ضرورتیں ہیں جو مکمل انصاف کی منزل کے راستے میں پیش آرہی ہیں۔ یہ نظریہ جو عوام پر اشرافیہ کی حکومت کا جواز پیش کرنے کے لئے اختراع کیا گیا ہے۔ قدیم اور تقدس مآب ریاکاری کی تازہ ترین شکل ہے۔

سماجی طبقے کا مفہوم

سماجی طبقوں کے اداروں پہ دو بنیادوں پر اعتراضات کیے گئے ہیں۔ یہ اعتراض ایک دوسرے سے الگ بھی ہیں اور ان میں ربط باہم بھی ہے۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ ان ملکوں میں بھی، جہاں کا سیاسی نظام رسمی طور پہ جمہوری ہے سماجی طبقات کا ادارہ خود سرانہ سیاسی اقتدار کی بنیاد بن جاتا ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ عام سماجی نابرابری کا ایک نظام قائم کر دیتا ہے جو اخلاقی طور پہ ناقابل جواز ہے۔ بے شمار سماجی شکستوں اور کشیدگیوں کا باعث ہے اور اس کی وجہ سے بہت سی اہلیتیں ضائع بھی ہو جاتی ہیں۔

سماجی طبقات اور سیاست کا باہمی تعلق ایک ایسا موضوع ہے جس پر کافی بحث ہو چکی ہے۔ مارکس کے سماجی نظریے کے مطابق وسائل پیداوار کی نجی ملکیت اور اس کے نتیجے کے طور پر سماج کی طبقات میں تقسیم سیاسی زندگی کی بنیاد ہے۔ سوسائٹی کے ایشیائی نظام کے امکانی استثنیٰ کے ماسوا حکمراں طبقہ ہمیشہ وہی طبقہ ہوتا ہے جو وسائل پیداوار کا مالک ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مارکس کے نظریے میں کافی صداقت موجود ہے۔ موجودہ دور میں بھی ایسی حکومتوں کا تصور کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں جو صرف طبقاتی حکمرانی کا آلہ ہیں۔ اقتصادی طور پر پسماندہ ملکوں میں جہاں زمین کی ملکیت سیاسی اقتدار کی کنجی ہے اور جہاں کے جاہل اور دولت سے محروم کسان عام حالات میں اپنے حقوق کا تحفظ یا اقتصادی لوٹ کی مزاحمت

کرنے کے اہل نہیں۔ اس قسم کی حکومتیں زیادہ عام ہیں۔

جس وقت مارکس اپنا نظریہ تحریر کرنے میں مصروف تھا، حکومت کا طبقاتی کردار زیادہ نمایاں تھا۔ لہٰذا اس وقت حکومت کو "تمام بورژوا طبقے کے مشترکہ مسائل کا انتظام کرنے والی کمیٹی" قرار دینا نہ تو یکسر غلط تھا نہ بالکل ہی نامناسب۔ مثلاً سو سال سے کچھ ہی زیادہ عرصہ ہوا ہے کہ برطانیہ کے عوام ووٹ کے حق کا جواب ایک طے شدہ حقیقت ہے مطالبہ کر رہے تھے اور ان کے لیڈروں کو یہ مطالبہ کرنے کی بنا پر خطرناک انقلابی قرار دیا جا رہا تھا۔ بیشتر یورپی ملکوں میں تمام بالغوں کو ووٹ کا حق انیسویں صدی کے اواخر یا بیسویں صدی کے اوائل میں حاصل ہوا ہے۔ اس سے پہلے سیاسی حقوق صرف جائداد کے مالکوں کو حاصل تھے۔ سیاسی جمہوریت چونکہ زمانۂ حال کی پیداوار ہے اس لئے مارکس کو اس بنا پر مورد الزام مشکل ہی سے ٹھہرایا جا سکتا ہے کہ وہ اس کے نتائج کا اندازہ لگانے میں ناکام رہا۔ مزید براں یہ صحیح بھی نہیں کہ اس نے تمام بالغوں کے لئے ووٹ کے حق کی اہمیت کا اندازہ کم لگایا۔ ۱۸۵۲ء میں ایک مضمون لکھتے ہوئے اُس نے اصلاحی تحریک کے حامیوں کے سیاسی پروگرام کا ذکر کرتے وقت اعلان کیا تھا "ان حالات میں برطانیہ میں سب کے لئے ووٹ کے حق کا حصول اتنا بڑا سوشلسٹی اقدام ہوگا کہ براعظم پر رونما ہونے والے کسی بھی واقعے کو جسے اس قسم کا عزت مندانہ نام دیا جا سکے اس کے ہم پلہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس ملک میں اس کا ناگزیر نتیجہ مزدور طبقے کی سیاسی بالادستی ہوگا۔"

مارکس کے شاگرد اس کی طرح صاحب فراست نہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں یہ سوال کبھی پیدا نہیں ہوتا کہ ان کے اُستاد کے نظریے کا موجودہ جمہوری معاشروں پر جو اقتصادی طور پر ترقی یافتہ بھی ہیں کسی ردوبدل کے بغیر کہاں تک

اطلاق ہو سکتا ہے۔ اس بات سے انکار البتہ مشکل ہی سے کیا جا سکتا ہے کہ اس میں تھوڑی بہت صداقت موجود ہے۔ حکومتوں کا طبقاتی کردار اب بھی قائم ہے۔ امریکہ میں یہ بات کافی کم ہے لیکن یورپ میں بڑی بڑی سیاسی پارٹیوں میں طبقاتی لائنوں پر خط امتیاز کھینچا جا سکتا ہے اور یہ بات مشکل ہی سے بحث طلب ہے کہ مجموعی طور پر قدامت پسند حکومتیں جائداد کے مالکوں کے مفاد کی حمایت کا رجحان رکھتی ہیں اور سوشلسٹ حکومتوں کا رجحان ملازمت پیشہ لوگوں کی طرفداری ہے۔

لیکن کیا جائداد مالکوں کا گروپ اب بھی ایک حکمراں طبقہ ہے؟ بعض جمہوری سماجوں مثلاً فرانس اور امریکہ میں جائداد مالک بظاہر تھوڑا بہت اقتدار قائم رکھے ہوئے ہیں لیکن دوسرے ملکوں میں سوشلسٹ حکومتوں نے ان کے اقتدار کو بہت بڑی حد تک کم کر دیا ہے اور وہ مسلسل کم ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن طبقاتی نظام کی جو تفصیل اس سے پہلے کے بابوں میں پیش کی گئی ہے اس سے یہ بات بالکل ظاہر ہو جاتی ہے کہ ترقی یافتہ صنعتی ملکوں میں جائداد مالک ان معنی میں حکمراں طبقہ اب نہیں رہے کہ وہ سماج میں اپنی حیثیت کو برقرار رکھ سکیں، اس کو بہتر بنا سکیں اور سماجی حیثیت میں زیادہ برابری پیدا کرنے کے لئے جو دباؤ پڑ رہا ہے اس کا مقابلہ کر سکیں۔ ووٹ کے ہمہ گیر حق نے یہ بات ممکن بنا دی ہے کہ جائداد مالکوں کی طاقت کو پرامن طریقوں سے ختم کیا جا سکے اور حکومتوں کے کردار کو تبدیل کیا جا سکے۔ اب وسائل پیداوار کو مزدوروں کے مفاد کا لحاظ رکھے بغیر استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ جمہوری حکومتوں نے اس سلسلے میں جو پابندیاں عائد کی ہیں انھوں نے جائداد مالکوں کے اختیارات کو بہت حد تک محدود کر دیا ہے۔ جائداد اب بجائے خود اس کی ضمانت نہیں کہ اس کے مالک کو سماج کے سیاسی معاملات میں غالب حصہ مل جائے گا۔ موجودہ جمہوری سماجوں میں سیاسی طاقت متعدد سماجی

گروپوں میں تقسیم ہو جاتی ہے مثلاً کارخانہ دار، ٹریڈ یونینیں اور مختلف قسم کی دوسری
رضاکارانہ تنظیمیں۔ ان میں سے ہر گروپ حکومت کی پالیسی پہ اثر انداز ہوتا ہے۔

مزید برآں جمہوری حکومتوں کا جماعتی کردار اگرچہ اب بھی قائم ہے لیکن
انیسویں صدی کی طرح اب جماعتی کردار ان کا نمایاں پہلو نہیں۔ جن ملکوں میں
ایک سے زائد پارٹیوں کا نظام موجود ہے وہاں ہر حکومت ہر حالت میں ایک الحاقی
حکومت ہوتی ہے جسے برسر اقتدار رکھنے میں ایسے گروپوں کا ہاتھ ہوتا ہے جن کے
سماجی اور سیاسی مفاد ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ جہاں دو پارٹیوں کا
نظام ہے وہاں کسی بھی پارٹی کے متعلقین یکرنگ نہیں ہوتے۔ نئے متوسط طبقوں
کے منظر عام پہ آنے کا ایک نتیجہ یہ ہوا ہے کہ انھوں نے بنیادی پارٹیوں کے انتخابی
پروگرام اور ان کے عام مقاصد میں اعتدال پیدا کر دیا ہے خواہ یہ پارٹیاں خصوصی
امداد کے لئے روایتی انداز میں کسی خاص طبقے سے کتنی ہی اپیل کرتی رہیں۔ اس امر کو
ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ بیشتر جدید جمہوریتوں میں سماجی پالیسی کے اس حصے
میں اضافہ ہو رہا ہے جس کے متعلق بنیادی پارٹیوں میں اتفاق ہوتا ہے۔ قوم کے
مجموعی مفاد کے معاملے میں یہ اتفاق جس حد تک بڑھتا ہے اسی حد تک شدید
طبقاتی اختلافوں میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ اس کا انحصار اس بات پہ ہے کہ مراعات
یافتہ گروپ اپنی مراعات سے کس حد تک دستبردار ہوئے ہیں اور انھوں نے
خالص خود غرضانہ مفاد کی تکمیل سے ہاتھ اٹھا کر طبقاتی اختلافات میں کہاں تک
حقیقی کمی کی ہے۔ جہاں مادی خوشحالی اور ثقافتی طور پہ آگے بڑھنے کے امکانات میں
بہت زیادہ فرق ہوں گے وہاں نہ تو قومی وحدت ممکن ہے نہ قومی مفاد کی وحدت۔

صنعتی ملکوں میں سیاسی ارتقا نے جو انداز اختیار کیا ہے وہ کئی پہلوؤں سے
مارکس اور اس کے بیشتر پیروؤں کی توقعات سے مختلف ہے۔ صرف یہی نہیں کہ جاگیردار

کی ملکیت اب اتنی زیادہ سیاسی حکمرانی کی بنیاد نہیں رہی بلکہ یہ بھی ہے کہ خود جائداد کی ملکیت پر ووٹ کے ہمہ گیر حق پر مبنی سیاسی قوت نے پابندیاں لگا دی ہیں بیشتر جمہوری ملکوں میں اونچے ٹیکس لگا کر صرف چند ہاتھوں میں دولت کے ارتکاز کو روک دیا گیا ہے اور صنعتی ملکیت پر صرف کڑی پابندیاں ہی نہیں لگائی گئیں بلکہ کئی صورتوں میں ان کا انتظام قوم نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے۔ مختلف سماجوں میں پبلک ملکیت کی حد تک مختلف ہے۔ برطانیہ، فرانس اور سکینڈے نیویا کے ممالک میں پبلک ملکیت میں برابر اضافہ ہوا ہے اور اب وہاں اجتماعی وسائل دولت کا پانچواں حصہ قومی ملکیت ہے۔ خود پبلک ملکیت نے بھی نئے سیاسی مسائل پیدا کر دیئے ہیں اور اب یہ بات صاف ہو گئی ہے کہ "وسائل پیداوار کی مشترکہ ملکیت" بجائے خود ایک ایسے منصفانہ نظام کے قیام کا باعث نہیں ہوتی جس میں افراد ایک پیچیدہ اور اجتماعی سماج میں رہتے ہوئے اپنی قوم کے سماجی انتظامات پر زیادہ سے زیادہ اثر انداز ہو سکیں۔ مینجروں اور بیوروکریٹوں کے غلبے کا خطرہ فرضی نہیں حقیقی ہے اور اس خطرے کو صرف منتر پڑھ کر دور نہیں کیا جا سکتا۔

مسئلہ کا بنیادی پہلو یہ ہے کہ سماجی طبقے، سیاسی اقتدار کی واحد بنیاد نہیں۔ سیاست کا یہ نظریہ اسرار آدرش پسندانہ نظریے کے مقابلے میں حقائق سے زیادہ قریب ہے جو ریاست کو ایک پُر اسرار عوامی عزم کا اظہار سمجھتا ہے اور اس انفرادیت کیشانہ نظریئے کے مقابلے میں بھی زیادہ حقیقت پسندانہ ہے جو ریاست کو آزاد اور مساوی الحیثیت افراد کے درمیان جو اپنے ذاتی مفاد کی دانشمندانہ تکمیل میں مصروف ہیں ایک غیر جانبدار ثالث قرار دیتا ہے۔ سیاست کا یہ نظریہ آدرش پسندانہ اور انفرادیت کیشانہ نظریوں کے مقابلے میں حقائق کے قریب ضرور ہے لیکن اس کے باوجود نامکمل ہے۔ ایسے راستے ایک سے زیادہ ہیں جن کے ذریعہ

کوئی سماجی گروپ سیاسی اقتدار حاصل کرسکتا ہے اور باقی سماج پر اپنا تسلط قائم کرسکتا ہے ۔ ایک ایسا سیاسی اور اقتصادی نظام جس میں جائداد ایک چھوٹی سی اقلیت کے ہاتھوں میں مرتکز ہو جائے سیاسی مطلق العنانی کے لئے سازگار ضرور ہے لیکن جیسا کہ سوویٹ یونین اور دوسرے کمیونسٹ سماجوں کے تجربے نے ثابت کردیا ہے مطلق العنانی ایک ایسے سماج میں بھی بہ آسانی پنپ سکتی ہے جہاں ذاتی ضرورت کی چیزوں کے سوا تمام جائداد پبلک کی ملکیت ہو ۔ اس سے ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہیئے کہ سماج کی کوئی بھی اقتصادی تنظیم بجائے خود نہ تو استبدادی سیاسی اقتدار کے خلاف تحفظ کا کام دے سکتی ہے اور نہ شخصی آزادی کی ضمانت بن سکتی ہے ۔ سماج میں شخصی آزادی کا تحفظ صرف سیاسی طریقوں سے ہی کیا جا سکتا ہے ۔ اس آزادی کی ضمانت ایسے ادارے ہیں جن میں واحد پارٹی کے نظام کی کوئی گنجائش نہ ہو اور جہاں اقلیتی گروپوں کو حفاظت دے کر اختلاف رائے کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہو ۔ اس سے مقصد سیاسی نظام پر سماج کے اقتصادی اور طبقاتی ڈھانچے کے اثرات سے انکار کرنا نہیں ۔ یہ اثرات اتنے بدیہی ہیں کہ انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ کہنا صرف یہ مقصود ہے کہ سیاست کا شعبہ صرف دوسرے شعبوں کا عکاس نہیں اور سماجی زندگی کے ایک شعبے کی تبدیلیاں دوسرے شعبوں کے مسائل کو لازمی طور پر حل نہیں کر دیتیں ۔

طبقاتی نظام کا دوسرا پہلو یعنی یہ امر کہ سماجی نابرابری کے ساتھ عمومی طور پر اس کا کیا تعلق ہے ۔ ایک زیادہ وسیع اور زیادہ پیچیدہ مسئلہ ہے اور ان صفحات میں میں اس پر صرف سرسری بحث ہی کر سکتا

ہوں[1]۔ طبقاتی سماج پر مساوات کے حامیوں کی طرف سے جو حملے کیے جاتے ہیں ان کا تعلق اُن کے سیاسی پہلوؤں سے قطع نظر جن پر اس سے پہلے بحث ہو چکی ہے نابرابری کے اخلاقی مسئلے کے ساتھ ہوتا ہے بالخصوص ان سماجی برائیوں کے ساتھ جو سماج کی طبقاتی تقسیم سے پیدا ہوتی ہیں اور جن کی وجہ سے انسانی صلاحیتوں سے پورا پورا فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ عہدے اور حیثیت کے وہ انتہائی فرق جو ابتدائی سماجوں کا خاصہ تھے یا جنھوں نے ان سماجوں کا حلیہ بگاڑ رکھا تھا، ان کے حامی اس دور میں بہت کم ہوں گے۔ اس فرق کی وجہ سے سماجی سلسلہ مدارج کی چوٹی پر بیٹھے ہوئے لوگوں کا رویّہ دوسرے انسانوں کے تئیں مغرورانہ اور حقارت آمیز بن جاتا تھا اور نچلی سطح کے لوگ مصیبت اور فرومائگی کا شکار ہو جاتے تھے۔ اس قسم کے فرق جدید جمہوری ملکوں میں بتدریج کم ہوتے گئے۔ موجودہ دور کا مسئلہ یہ ہے کہ اگر سماج کو جاری رہنا ہے تو نابرابری کس حد تک اور کن معنی میں ناگزیر بھی ہے اور اخلاقی جواز کے قابل بھی۔ ان مختصر سے صفحات میں صرف اتنا ہی ممکن ہے کہ چند قابل لحاظ امور پیش کر دیے جائیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ چند افراد کو اعلیٰ تہذیب، فنون لطیفہ اور نفیس زندگی مہیا کرنے کے مقابلہ میں یہ بات زیادہ ضروری ہے کہ سماج کے تمام ممبروں کے لئے زندگی اور تہذیب کے ایک معقول معیار کا انتظام کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سماجی پالیسی کی اہم مدات میں یہ دو مدیں زیادہ اہم

---

[1] قاری اگر چاہے تو اس مسئلے پر مندرجہ ذیل کتابیں پڑھ سکتا ہے۔ ایل۔ ٹی۔ ہوب ہاؤس کی کتاب "سماجی انصاف کے عناصر"۔ ٹی۔ ایم۔ مارشل کی کتاب "شہریت اور سماجی طبقے" اور آر۔ ایچ۔ ٹانیے کی کتاب "مساوات"۔

ہیں کہ ہر شخص کے لئے ملازمت کی گارنٹی دی جائے اور سماجی بہبود کے مناسب انتظامات کئے جائیں۔ اس مناسب معیار زندگی کے بعد یہ دلیل غلط نہیں کہ آمدنی اور مرتبے کا فرق اقتصادی اہلیت اور حسن کارکردگی کو برقرار رکھنے کے نقطۂ نگاہ سے بھی قابلِ جواز ہے اور اخلاقی بنا پر بھی۔ کہا جاتا ہے کہ سماجی سلسلۂ مدارج میں کسی فرد کو اس کا مناسب درجہ دینا ایک ایسا طریقہ ہے جو اہلیت کی مناسب تقسیم اور اس کے جائز انعام کی ضمانت ہے۔ یہ امکان کہ اپنی حیثیت کو بہتر بنایا جا سکتا ہے انفرادی کوشش کا محرک ہے اور حیثیت میں اضافہ اس کوشش کا انعام۔ عمل میں سماجی سلسلۂ مدارج اس آدرش طریقہ پر نہیں چلتا فرد کی اپنی کوشش کا انعام مناسب ہوسکتا ہے لیکن یہ کہاں تک مناسب ہے کہ اسے اس کے دادا یا پردادا کی کوششوں کا انعام دیا جائے؟ جب تک یہ قرار دیا جائے کہ والدین کا یہ حق کہ وہ اپنے بچوں کے معیار زندگی اور ان کی سماجی حیثیت کا تعین کریں باقی تمام حقوق کے مقابلے میں افضل ہے، اس وقت تک طبقاتی نظام کا ایک وراثتی نظام کی حیثیت سے اخلاقی جواز پیش کرنا ممکن نہیں اور اقتصادی حسنِ کارکردگی کے نقطۂ نگاہ سے بھی جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں یہ کچھ زیادہ قابل جواز نہیں۔ ایک سخت گیرانہ طبقاتی نظام کا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ وہ نااہلوں کو اونچی جگہوں پر برقرار رکھتا ہے اور بہترقدرتی اہلیت کو جو سماج کے نچلے طبقوں میں ہو حقیر اور معمولی کاموں میں مصروف رکھتا ہے۔

اگر ہم یہ نقطۂ نگاہ مان بھی لیں کہ اقتصادی وجوہ کی بنا پر تھوڑی بہت نابرابری ضروری ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم نابرابری کی کسی خاص حد کو بھی تسلیم کرلیں۔ انیسویں صدی کے برطانیہ میں اقتصادی نظام کو عمدہ طریق پر چلانے کے لئے انتہائی دولتمندی اور انتہائی افلاس کو بسا اوقات ضروری قرار دیدیا جاتا تھا لیکن

آج یہ ممکن نظر آتا ہے کہ نابرابری کو کم کر کے اقتصادی نظام کو زیادہ بہتر طریقے پر چلایا جا سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسی کوئی معین کسوٹی موجود نہیں جو یہ فیصلہ کر سکے کہ اہم سماجی عوامل کو حسن کارکردگی کے ساتھ انجام دینے کے لیے آمدنیوں میں نابرابری کس حد تک ضروری ہے۔ موجودہ جمہوری سماجوں میں آمدنیوں کے فرق کا فیصلہ اب بھی بہت بڑی حد تک دولت کی نامساوی تقسیم اور مختلف قسم کے کاموں کی رسمی قدر و قیمت کے رسمی تعین کی بنا پر ہوتا ہے اور قدر و قیمت کا فیصلہ کرنے والے مفروضے ماضی کے ان سماجوں سے اخذ کئے جاتے ہیں جن میں سلسلۂ مدارج زیادہ کڑا تھا۔

مثال کے طور پر برطانیہ میں پیشہ ورانہ مہارت رکھنے والوں کی آمدنی نسبتہً اونچی ہے۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ روایتہً یہ پیشے شرفا کے پیشے ہیں اور جزوا یہ کہ ان پیشوں کی تربیت کی مالی لاگت بہت زیادہ ہے اور ان کا بھاری معاوضہ اس لاگت کی تلافی سمجھا جاتا ہے۔ موجودہ ماحول میں جبکہ پیشہ ورانہ تربیت کی لاگت یونیورسٹی اور دوسری قسم کی گرانٹوں کے ذریعے زیادہ تر ریاست برداشت کرتی ہے۔ اعلیٰ آمدنی کی دلیل اپنا بہت سا وزن کھو دیتی ہے اور اب چونکہ یا تو ہم سبھی شرفا میں شامل ہیں یا ہم میں سے کوئی بھی اس صف میں شامل نہیں اس لئے شرافت امتیاز کا باعث مشکل ہی سے بن سکتی ہے۔ مختلف پیشوں کے لئے مناسب مالی معاوضہ کیا ہونا چاہیئے اس پر مسلسل نظرثانی ہو رہی ہے اس نظرثانی پر اقتصادی ضرورتیں بھی اثر انداز ہو رہی ہیں اور موجودہ دور کے سماجی آدرش بھی۔ ہو سکتا ہے کہ تجربے سے یہ ثابت ہو جائے کہ موجودہ سماج مالی معاوضے میں بہت کم فرق کے ساتھ بھی عمدگی سے چل سکتا ہے۔

بہرحال اقتصادی اہمیت آمدنیوں کی تھوڑی بہت نابرابری کا چونکہ

ایک اہم جواز ہے اس لئے موثر سماجی حرکت پذیری بہت ضروری ہے تاکہ اس کی ضمانت مل جائے کہ ملازمت اور معاوضے میں اہلیت و نا اہلیت دونوں کا مناسب لحاظ رہے گا۔ ظاہر ہے کہ موجودہ دور کے بیشتر سماجوں میں سماجی حرکت پذیری کی رفتار اس تقاضے کو پورا نہیں کرتی اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ امریکہ میں سماجی حرکت پذیری ہمیشہ کافی رہی اور دوسرے جمہوری سماجوں میں بھی جہاں سماجی پالیسی بالخصوص تعلیمی پالیسی سماجی حرکت پذیری میں اضافہ کرنے کی پابند ہے اس کی رفتار میں متواتر اضافہ ہوتا رہا ہے۔

جمہوری سماجوں میں تشکیل درجات کا جو نظام تشکیل پا رہا ہے وہ ایک ایسا نظام ہے جس میں معاوضے اور سماجی حیثیت کا پیشے کے ساتھ گہرا تعلق ہے جائداد کی ملکیت کا اثر مسلسل طور پر زوال پذیر ہے۔ درجات کے زیر تشکیل نظام میں فرد کے پیشے کا انحصار اس کی قدرتی اہلیتوں پر زیادہ سے زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ کچھ تو تعلیم کا انتخاب ہے اور کچھ سماجی عروج و زوال کے عوامل۔ یہ سماجیں نہ تو غیر طبقاتی ہیں اور نہ غیر طبقاتی ہونے کی مدعی۔ لیکن یہ انیسویں صدی کے طبقاتی سماجوں سے بہت مختلف ہیں۔ اب سماجی سلسلۂ مدارج کی تشکیل سماجی طبقوں سے کم ہوتی ہے اور ہم رتبہ گروپوں سے زیادہ اب سلسلۂ مدارج منظم یا جزوی طور پر منظم اقتصادی گروپ پر مشتمل نہیں جن کے ایک دوسرے کے ساتھ مراسم معاندانہ ہوں بلکہ نیا سلسلۂ مدارج متعدد گروپوں پر مشتمل ہے جنھیں ایسے افراد کے مجموعے کہنا زیادہ مناسب ہے جن کا سماجی وقار ایک جیسا ہو۔ ان گروپوں کی بنیاد ایسی مشابہتوں پر ہے جو کلیتہً اقتصادی نہیں اور ان کے باہمی مراسم بنیادی طور پر معاندانہ نہیں ہیں بلکہ ان کی بنیاد جزوًا مقابلے پر ہے اور جزوًا ہمسری کی کوشش پر۔ اس طرح ایسے طبقوں پر مشتمل ہونے کی بجائے جو قوم کے مفاد کو خطرے میں ڈال کر اپنے اپنے اقتصادی مفاد کی تکمیل میں مصروف ہوں جمہوری سماجیں گروپوں کے ایک ایسے نظام کی طرف بڑھ رہی ہیں جن میں علیحدگی کا

وصف کم ہے۔ ان کی حدیں نسبتہً غیر واضح ہیں۔ سماجی سطح کا فرق نسبتہً کم ہے اور جو اپنے تنگ دلانہ گروہی مفاد کی پیروی اس شدت کے ساتھ نہیں کرتے جس شدت کے ساتھ پرانے طبقے کیا کرتے تھے۔

اگرچہ بیشتر ملکوں میں دولت کی موثر تقسیم جدید ناگزیر ہے لیکن کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ سماجی گروہوں میں آمدنی کی موثر تقسیم جدید کے بغیر بھی سماجی برابری کی طرف جو بحالات موجودہ صرف مناسب موقع اور آسان تر سماجی میل جول تک محدود ہے مزید قدم نہ بڑھایا جاسکے کیونکہ مساوات کی راہ کا ایک اہم قدم یہ ہے کہ آمدنی کے فرق کو سماجی درجے کے لئے بے معنیٰ بنا دیا جائے۔ جیسا کہ سماج کے بیشتر شعبوں میں اب بھی ہے[1]۔ آر۔ ایچ۔ ٹانی کے الفاظ میں "ایک ایسی قوم کا تصور کرنا ممکن ہے جس میں اقتصادی فرائض کے ضروری اختلاف کے ساتھ ساتھ بہت بڑی حد تک اقتصادی اور سماجی مساوات بھی موجود ہو۔ اس قسم کے سماج میں افراد کے پیشے اور ان کی آمدنیاں اگرچہ مختلف ہوں گی لیکن اس کے باوجود وہ ایک ہی ماحول میں رہیں گے، انھیں صحت قائم رکھنے اور تعلیم حاصل کرنے کی ایک ہی جیسی سہولتیں حاصل ہوں گی اور انھیں ان کی اہلیتوں کے مطابق الگ الگ

---

[1] مانچسٹر گارڈین میں ایک سلسلۂ مراسلات شائع ہوا تھا جسے بعد میں "طبقات کا طرز زندگی" کے نام سے شائع کردیا گیا ہے۔ اس سلسلۂ مراسلات سے ظاہر ہوتا تھا کہ برطانیہ کے طبقۂ متوسط کے ۵۰ پونڈ سے ۵۰۰ تک کی آمدنی کی سطح کے لوگوں میں حیرت انگیز مشابہت ہے۔ آمدنی کی اس سطح کے اوپر بھی بڑا فرق یہی تھا کہ بچوں کی تعلیم پر زیادہ روپیہ صرف کیا جاتا تھا۔ یہ قیاس غیر دانشمندانہ نہیں کہ وہ ستر اسّی افراد جو اس مراسلت میں شریک تھے ایک دوسرے کے ساتھ ہمرتبہ افراد کی حیثیت سے ہی ملاقات کریں گے۔

عہدے مل جائیں گے اور یہ عہدے آسانی سے دستیاب ہوں گے ۔ یہ افراد آپس میں آزادانہ شادیاں کریں گے ۔ انھیں افلاس کی ذلیل کن صورتوں سے نجات کبھی حاصل نہ ہوگی اور اقتصادی جبر سے تحفظ بھی[1] ۔ اس بات کا انحصار برابری پیدا کرنے والی ان قوی ایجنسیوں ، مفاد عامہ کے شعبوں ، بالخصوص تعلیم کے ارتقا پر ہے کہ اس قسم کا سماج بروئے کار آئے گا یا نہیں لیکن ہمیں اس انتباہ کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ ایسا تعلیمی نظام جو یکساں مواقع کے مطالبے کو قابل ستائش حد تک پورا کرتا ہو تعلیم اور پیشے کے رابطۂ باہم کی بنا پر نئے سماجی نابرابریاں بھی قائم کر سکتا ہے جو اس بنا پر اور بھی شدید ہوں گی کہ ان کا آزمودہ انفرادی اہلیت کے ساتھ گہرا تعلق ہوگا ۔

اس رجحان کا مقابلہ کرنے کا ایک طریقہ یہ ہوگا کہ تمام افراد کو ان کی اہلیت سے قطع نظر کم سے کم تعلیمی استعداد مہیا کر دی جائے جیسا کہ برطانیہ میں جامع اسکولوں کے حامیوں کی طرف سے مطالبہ کیا جا رہا ہے ۔ اس قسم کے ماحول میں جہاں تعلیم کی سطح عمومی طور پر اونچی ہو یہ بات ممکن ہے کہ تعلیم ، پیشے اور سماجی درجے کا باہمی تعلق اسی طرح کمزور پڑ جائے جس طرح آمدنی اور سماجی درجے کا تعلق کمزور پڑ گیا ہے ۔ ہم ایک ایسے سماج کا تصور ضرور کر سکتے ہیں جس میں پیشے آمدنی ، دولت اور تہذیب کے اختلاف جو آئینی اور سیاسی مراعات کے خاتمے کے بعد سماجی سلسلۂ مدارج کی بنیاد بن گئے ہیں سماجی درجے کے لیے بے معنیٰ بن جائیں گے ۔ اور جس میں نتیجے کے طور پر سماجی سلسلہ مدارج کا وجود باقی نہیں رہے گا ۔ اس قسم کے سماج میں بھی افراد کے درمیان

---

[1] آر ۔ ایچ ۔ ٹانے کی کتاب "مساوات"

وقار اور اقتدار کا فرق باقی رہے گا جس کا تعین ان کے ذاتی اوصاف کریں گے یہ فرق ان کی سماجی سرگرمی کے ہر شعبے میں نمایاں ہوگا۔ ان کے کام میں بھی، ان کے اوقاتِ فرصت کی تفریحات میں بھی اور ان کی سیاسی سرگرمیوں میں بھی لیکن کوئی ایسا ہمہ گیر سلسلۂ مدارج باقی نہیں رہے گا جس میں افراد کے گروہوں کو بہ لحاظ وقار مستقل درجے دیدیئے گئے ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی سماج کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ دولت، آمدنی اور تہذیب کے اعتبار سے اس میں بہت زیادہ فرق نہ ہوں، اتنے فرق تو ہرگز نہیں رہنے چاہئیں جتنے اس وقت بیشتر جمہوری ملکوں میں موجود ہیں۔

یہ قیاس آرائیاں مستقبل کے متعلق ہیں لیکن ایک ایسے مستقبل کے متعلق ہرگز نہیں جو بہت دور ہو۔ ہم یہ امید بجا طور پر کرسکتے ہیں کہ جمہوری ملکوں میں اقتصادی برابری مسلسل اور بتدریج کم ہوتی جائیں گی اور اس کے ساتھ ہی ان بڑے بڑے سماجی گروہوں کے لئے بہتر تعلیم حاصل کرنے اور زیادہ مہذب بننے کے امکانات بڑھتے جائیں گے جنھیں جدید صنعت کی بے اندازہ بار آوری کے باوجود زیادہ اطمینان بخشی اور زیادہ مہذب زندگی کے حصول کے معاملے میں اب تک بہت ہی کم فائدہ پہنچا ہے۔ دوسری طرف ہم یہ بھی امید کرسکتے ہیں کہ کمیونسٹ سماجوں میں نابرابری بڑھتی جائے گی اور حکمراں اشرافیہ کو جو مادی اور تہذیبی مراعات حاصل ہیں ان میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ سیاسی جمہوریت کا ماحول سماج کے اقتصادی نظام سے بالکل ہی الگ ہرگز نہیں لیکن یہ بھی صحیح نہیں کہ اس کا فیصلہ اقتصادی نظام ہی کرتا ہے۔ جہاں سیاسی جمہوریت کا ماحول نہیں ہوگا وہاں ایک مراعات یافتہ طبقہ اپنے مراعاتِ خصوصی کو برقرار بھی رکھ سکتا ہے اور ان میں اضافہ بھی کرسکتا ہے قطع نظر اس بات کے کہ وہ وسائل پیداوار کا مالک ہے یا نہیں۔

ایک انتہائی پیچیدہ ادارے کے اس مختصر سے مطالعے سے چند عملی نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ بالخصوص یہ کہ ایک غیر طبقاتی سماج کا تصور جس میں سماجی مساوات کا تصور شامل نہ ہو صرف مبہم ہی نہیں بلکہ بیہودہ اور غیر حقیقی بھی ہے۔

جو لوگ اقتدار اور آسودگی کی مساوی تر تقسیم کے لئے کوشاں ہیں انھیں دھوکا دینے اور بالآخر ان کے حوصلے پست کرنے میں یہ تصور کامیاب اس لئے ہو جاتا ہے کہ "تاریخی طور پر سماجی نابرابری کے تصور کے ساتھ اس کا تعلق موجود ہے۔ انیسویں صدی میں غیر طبقاتی سماج کا مطلب ایک ایسا سماج تھا جس میں نہ مراعات ہوں اور نہ استبدادی حکومت۔ آج اگر سوویٹ یونین کو ایک غیر طبقاتی سماج قرار دے دیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ اصطلاح اب کسی واضح مفہوم کی حامل نہیں رہی۔

اس معاملے میں اختلاف رائے ممکن بھی ہے اور موجود بھی کہ سماجی برابری کی کون سی حد ایسی ہے جو مستحسن یا قابل عمل ہے لیکن ایک جمہوری سماج کے کم سے کم تقاضوں کے متعلق کافی حد تک اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ مراعات یافتہ اقلیتوں کے ناواجب اثر و رسوخ کا ازالہ کرنے کے لیے سماجی پالیسی مرتب کرتے وقت تمام شہریوں کے مفاد کو پیش نظر رکھا جانا چاہیئے اور یہ کہ اقتصادی نابرابری کو اس حد تک کم ضرور کر دیا جانا چاہیئے کہ وہ سماج کے تمام ممبروں کے لئے ایک مناسب اور اطمینان بخش معیار زندگی کی ضمانت بن جائے۔ جن جمہوری سماجوں کا میں نے اس کتاب میں ذکر کیا ہے وہ ان تقاضوں کو بڑی حد تک پورا کرتے ہیں اور جیسا کہ میں نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ایک ایسی سماجی

مساوات کے لئے جو ان کم سے کم تقاضوں سے بہت آگے جاتی ہو۔ ایک مسلسل تحریک موجود رہی بھی ہے اور موجود ہے بھی۔ سماج کی ایک زیادہ منصفانہ تنظیم کے لئے پُرامن تبدیلی کا یہ تجربہ انتہائی قدر و قیمت کا حامل ہے۔ یہ ایک ایسا سبق ہے جس سے دنیا کے دوسرے حصوں میں مراعات کی مخالفت اور حقوق انسانی کی توسیع کی جدوجہد میں بہت فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

چند قابل مطالعہ کتابیں

نیشنل اکاڈمی ۲ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی سے منگائیے

اُنیس سو چوراسی

مشہور مصنف جارج آرویل کا شہرۂ آفاق ناول اُردو لباس میں۔ اُنیس سو چوراسی کا اردو ایڈیشن با تصویر ہے اور اس مشہور کتاب کا ترجمہ اُردو کے مشہور ادیب جناب سہیل واسطی نے کیا ہے۔ کتابت و طباعت کی خوبیوں کا اس کتاب نے ایک نیا معیار قائم کیا ہے۔ قیمت دو روپے پچاس نئے پیسے۔

کمیونزم اور کسان

اپنے موضوع پر دنیا بھر میں پہلی مستند کتاب جو اس موضوع پر حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے مشہور سکالر شری رام سروپ کی کئی سال کی ریاضت کا ثمرہ۔ ایشیائی ملکوں میں مشترکہ کاشت کا اصل مفہوم سمجھنے کیلئے یہ کتاب پڑھئے۔ کتاب مجلد ہے اور کتابت وطباعت معیاری قیمت دو روپے پچاس نئے پیسے۔

سوویٹ نظام کی چھ کنجیاں

اگر آپ کلیت کیشی پر مبنی سوویٹ نظام کی ماہیت اور اس کے اصول حرکت کو سمجھنا چاہتے ہیں تو یہ کتاب پڑھیئے۔ ملک کے ممتاز اخبارات و رسائل نے اس کتاب کی جامعیت اور افادیت کو بیحد سراہا ہے مصنف برٹرم ڈی وولف۔ مترجم گوپال متل۔ قیمت ایک روپیہ۔

لینن

انقلاب روس کے بانی نکولائی لینن کے مستند ترین سوانح حیات مہد سے لحد تک۔ لینن کے ایک رفیق کار ڈیوڈ شوب کے قلم سے کسی رنگ آمیزی کے بغیر اصل حالات واقعات کے بیان سے لینن کی تصویر اُجاگر کی گئی ہے۔ مترجم گوپال متل۔ قیمت صرف ایک روپیہ۔

ہمارے دور کا انقلاب

موجودہ دور کے انقلابی تقاضے کیا ہیں اور ہمیں کس قسم کے انقلاب کی ضرورت ہے؟ ایک عالمانہ بحث جسے پڑھ کر عصری رجحانات اپنی پوری تفصیل کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں اور عالمی سیاست کی کوئی گتھی نہیں رہتی۔

قیمت صرف ۲۵ نئے پیسے

اقتصادی تعاون

یہ دور تعاون کا دور ہے [illegible] لیکن ترقی یافتہ ملکوں کا قرض [illegible] ملکوں کو [illegible] لیکن کیا ترقی یافتہ ملکوں [illegible] آزادی اور خود مختاری کو نقصان پہنچائے بغیر ممکن ہے؟ ایک انتہائی معلومات افزا بحث۔

قیمت صرف ۲۵ نئے پیسے

نئی دنیا کی جھلکیاں

اقتصادی سامراج

سامراج دشمنی اس دور کا مزاج ہے لیکن سامراج بھی مختلف بھیس بدل کر سامنے آرہا ہے اس کی تازہ ترین شکل ہے اقتصادی سامراج جو پرانے سامراج سے کہیں بدتر ہے۔ یہ سامراج اپنے پاؤں کس طرح پھیلاتا ہے۔ اس کتاب میں مفصل پڑھیے۔

قیمت صرف ۲۵ نئے پیسے

موجودہ سماج میں طبقاتی نظام

طبقاتی نظام اور اس سے پیدا ہونیوالی نابرابری کے خلاف فلسفی اور سیاستداں ایک مدت سے جہاد کر رہے ہیں لیکن بسا اوقات یہ جہاد نعروں سے آگے نہیں بڑھتا۔ اس کتاب میں طبقاتی نظام کی سرشت سے خالص علمی انداز میں بحث کی گئی ہے۔

قیمت صرف ۲۵ نئے پیسے

نیشنل اکاڈمی ۔ ۹ ۔ انصاری مارکیٹ ۔ دریا گنج دہلی